اپنے حصّے کے خواب

ڈاکٹر زینت کیفی

راجستھان اردو اکادمی، جے پور

اپنے حصّے کے خواب

ڈاکٹر زینت کیفی

اپنے حصّے کے خواب

(افسانے)

ڈاکٹر زینت کیفی

ناشر

راجستھان اُردو اکادمی

ج - ۳، سُبھاش مارگ، 'سی' اسکیم، جے پور

سلسلۂ مطبوعات راجستھان اُردو اکادمی نمبر

نام کتاب : اپنے حصے کے خواب (افسانے)
شاعر : ڈاکٹر زینت کیفی
سن اشاعت : ۲۰۰۰ عیسوی (باراوّل)
قیمت : ستّر روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس

ناشر : راجستھان اردو اکادمی، جے پور

معظّم علی سکریٹری راجستھان اردو اکادمی جے پور نے نازش بک سینٹر کے توسّط سے ایم-آر آفسیٹ پریس دہلی سے طبع کرا کے اکادمی کے دفتر جے-۳، سُبھاش مارگ، 'سی' اسکیم، جے پور سے شائع کیا۔

فہرست

پیش لفظ / معظّم علی (سکریٹری) ۷
پیش گفتار / ڈاکٹر سیّد مدبّر علی زیدی (چیرمین) ۹

اُمیدوں کے سائے تلے ۱۱
صبح کے انتظار میں ۲۲
خاموش محبّت ۲۸
زندگی کے موڑ پر ۳۴
ایک خواب اور ۴۲
ہار جیت ۴۶
سائبان ۵۰
روح کا قرض ۵۵
ادھورے سوال ۶۵
خلش ۷۴
ایک قدم اور ۸۸
وہی قربتیں وہیں فاصلے ۹۸
اپنے حصّے کے خواب ۱۰۸

پیش لفظ

راجستھان بڑا مردم خیز خطّہ ہے؛ حالانکہ اناج کے معاملے میں اسے ریگستان کہا جاسکتا ہے لیکن ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے یہ ہمیشہ نخلستان بنا رہا۔ یہاں کے ادیب، شاعر اور ناقد اردو ادب کی تاریخ کے روشن ستارے ثابت ہوئے ہیں۔ اگر ایک طرف حافظ محمود شیرانی، اخترؔ شیرانی، عصمت چغتائی، عظیم بیگ چغتائی، بسملؔ سعیدی، مخمورؔ سعیدی، ش ک نظام موجودہ دَور کے اہم نام ہیں، جن کے ادبی کارناموں کا سبھی نے اعتراف کیا ہے، تو دوسری طرف عہدِ قدیم میں اکبرؔ علی خاں گلؔ، مولانا تسلیمؔ، مرزا مائل، مولانا مبین، مولانا کوثر، منشی چاند بہاری لال صبا، مولانا قمر واحدی جیسے اعلیٰ شعرا کی خدمات اور فنّی مہارت کے بھی سبھی قائل رہے ہیں۔

حکومتِ راجستھان نے ۱۲ر فروری ۱۹۷۹ء کو راجستھان اُردو اکادمی کا قیام صوبے میں اردو زبان و ادب کے فروغ اور یہاں کے شعری و ادبی سرمایے کی ترویج و اشاعت کی غرض سے کیا تھا۔ مئی ۱۹۹۹ء میں اکادمی کی تشکیلِ جدید کے بعد اِس بنیادی مقصد کی طرف ترجیحی توجہ کی گئی اور اکادمی نے پورے صوبے سے شعرا و ادبا کے انتخابات و تذکرے تیّار کرانے کا جامع منصوبہ بنایا۔ ڈاکٹر زینت کیفی کی پیشِ نظر کتاب

"اپنے حصّے کے خواب" اسی منصوبے کے تحت شائع کی جا رہی ہے۔ اس کام میں کچھ خامیوں کا رہ جانا ممکن ہے لیکن خلوصِ نیّت میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے اور خلوص قائم رہے تو غلطیوں کا ازالہ بھی ممکن ہے۔

میں اپنے تمام کرم فرما اور معاونین کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امّید کرتا ہوں کہ وہ اکادمی کے کاموں میں مجھے اسی طرح تعاون دیتے رہیں گے۔

معظّم علی

سکریٹری، راجستھان اردو اکادمی

جے پور

پیش گفتار

ڈاکٹر زینت کیفی کے افسانوں کا مجموعہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ افسانے روز مرّہ زندگی کے واقعات کی عکاسی کرتے ہیں خصوصاً عورت و مرد کے رِشتوں کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ آزادیِ نسواں کی تحریک کا ان افسانوں پر گہرا اثر ہے۔ سماج میں عورت کا مقام مرد کے برابر ہو اس کی پُرزور وکالت کی گئی ہے۔ اس کا حل یہی ہے کہ عورت اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو۔ مالی اعتبار سے خودکفیل ہونے پر عورت کی کئی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر شوہر ناکارہ یا بد چلن نکلے یا عورت پر ظلم وستم کرے تو وہ اس کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

زینت کے افسانوں میں حقیقت نگاری پر زیادہ اصرار ہے۔ وہ تخیّل و جذبات کو حاوی نہیں ہونے دیتیں اور قوّتِ ممیّزہ کا پابند رکھتی ہیں۔ ان کا افسانہ ''روح کا قرض'' ایک سچّے واقعہ پر مبنی ہے۔ اسی طرح ان کے دیگر افسانے بھی زیادہ تر سچّے واقعات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ افسانے اور حقیقت میں جو فرق ہے اس کا پتہ چلتا ہے جب ہم ''روح کا قرض'' پڑھتے ہیں۔ اس میں جو دل کو چھو لینے والی کیفیت پائی جاتی ہے وہ زندگی میں حقیقت سے رُوبرُو ہو کر اس کا اظہار کرنے سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ حقیقت افسانے سے زیادہ پُرتاثیر ہوتی ہے۔ حقیقت کو تخیّل اور جذبے سے ہم آہنگ کر کے ہی اچھا افسانہ تخلیق کیا جاتا ہے۔ میکسم گورکی، چیخوف، موپاساں، او۔ ہنری کے افسانوں میں حقائق پر مبنی واقعات کو دلکشی سے افسانے کے رنگ میں پیش کرنے کا گُر یہی ہے

کہ ان عظیم افسانہ نگاروں نے زندگی کی تلخ سچّائیوں اور ان کے تضادات کو فن سے جلا بخشی ہے۔ یہ محض فرضی واقعات اور تخیّل کی کاریگری سے ممکن نہیں ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، بیدی، عصمت اور منٹو کے کامیاب افسانوں میں حقیقت نگاری کا صداقت آمیز اظہار نظر آئے گا۔ پریم چند کا افسانہ "کفن" اس کی روشن مثال ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا راست اظہار اس افسانے کو پُرتاثیر بناتا ہے۔

ڈاکٹر زینت کیفی کی افسانہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت رواں اور بے تکلّف نثر استعمال کرتی ہیں۔ ان کے مکالمے روزمرّہ کی زبان میں ہی ہوتے ہیں۔ وہ افسانے میں کرافٹ پر اتنا دھیان نہیں دیتیں جتنا حقیقت کے راست اظہار پر توجّہ دیتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں عورت کی نفسیات اور اس کے دُکھ درد کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ وہ عورت کو محض جاپانی گڑیا سمجھنے کے خلاف ہیں۔ عورت کی اپنی شخصیت ہونی چاہیے نہ کہ وہ شوہر کی شخصیت کا عکس بن کر رہ جائے۔

راجستھان اردو اکادمی جے پور عورتوں کے حقوق کی وکالت کرنے پر توجّہ دے رہی ہے۔ ہندوستان کی ترقّی میں عورتوں کی خدمات پر سمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں ہندوستان کی اعلیٰ درجہ کی صاحبِ قلم عورتوں نے مقالے پڑھے۔ ان مقالوں کو نخلستان (جنوری-مارچ ۲۰۰۰) کے خصوصی شمارے میں شائع کیا جارہا ہے۔ عورتوں کی تخلیقات کو اکادمی زیادہ اہمیت دیتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر زینت کیفی کی تخلیقی صلاحیت ترقّی کی طرف گامزن رہے گی۔ شاعری کے میدان میں بھی انھوں نے بڑا نام کمایا ہے۔ حال ہی میں وہ امریکہ کی اردو اکادمی کے مشاعرے میں حصّہ لینے کے لیے امریکہ تشریف لے گئی تھیں۔ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ شائع ہو کر شائقینِ ادب کی مسرّت کا باعث ہوگا۔

ڈاکٹر سیّد مدبّر علی زیدی
چیرمین، راجستھان اردو اکادمی، جے پور

اُمیّدوں کے سائے تلے

رات کس قدر کالی اور سنسان تھی۔ ہر شخص لحاف میں دُبکا میٹھی میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا...... کتّوں کے رونے اور بھونکنے کی آوازیں ماحول کے اس سونے پن کو تھوڑی دیر کے لیے شور کا احساس کرادیتی تھیں۔ امّی ابوّ کے کمرے سے مسلسل خرّاٹوں کی آواز آرہی تھی۔ جاگ رہی تھی تو صرف سمن، جس کی ناکام حسرتیں آج دم توڑ رہی تھیں، جس کے ادھورے خواب آج ریزہ ریزہ ہوکر بکھرنے والے تھے۔ آنے والے سنہرے کل کا اس نے بہت انتظار کیا مگر سب بے سود رہا۔

اس نے اپنی امّی کی بہت منّت سماجت کی۔ اپنے آنسوؤں اور محبّت کا بہت واسطہ دیا۔ مگر وہ تو چٹان کی طرح سخت بن گئی تھیں، جس پر موسم کی تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیا ہوا اگر امتیاز سنّی تھا۔ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کبھی یہ تلقین نہیں کی تھی کہ مسلمان فرقوں میں تقسیم ہوجائیں۔ مذہبی تفرقہ کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہائیں۔ ہر سال لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں محرّم کے موقع پر شیعہ اور سنّیوں کا کتنا زبردست تصادم ہوتا ہے۔ کتنے ہزاروں لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا سر پھوڑدیتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب بھی اس قسم کا واقعہ کہیں ہوتا تھا تو یہی امّی بڑے بڑے لیکچر س پلایا کرتی تھیں کہ شیعہ سنّی میں کیا رکھا ہے۔ پھر وہ ہمارے ننھیال کا حوالہ دے کر کہتیں دیکھو وہ لوگ نماز پانچوں وقت کی نہیں پڑھتے مگر مجلس کہیں بھی ہو اس کے لیے چوہدّی میں گھوم لیں گے۔ پھر وہ پھوپھی جان کی طرف متوجہ ہوتیں۔ آپ

کے یہاں بھی یہ جو محرّم میں ڈھول تاشے بجائے جاتے ہیں، یہ بھی بالکل غیر اسلامی طریقہ ہے۔ پھوپھی جان بے چاری گردن ہلا کر کہتیں ہاں اچھا تو نہیں ہے مگر صدیوں سے بزرگ یہی کرتے آئے ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے۔ پھر امّی کہتیں اللہ بخشے ہمارے ابّا محرّم پر علَم لیے پھرتے تھے، ڈھول تاشوں کے ساتھ جبکہ روایت ہے کہ یزید نے حضرت حسین کا سر قلم کر کے نیزے پر ٹانگ کر شہر بھر میں گھمایا تھا۔ پھر خالہ بیگم بھی درمیان میں بولتیں۔ باجی آپ تو جہاں اچھا لڑکا ملے وہیں ثُمن کے ہاتھ پیلے کر دینا۔

مگر آدمی کے خیالات اپنے لیے کچھ اور ہوتے ہیں، دوسروں کے لیے کچھ اور۔ دوسروں کو بڑے بڑے لیکچر پلانے والی یہی امّی آج امتیاز کی دُشمن بن گئی تھیں۔ کیا شیعہ اور سنّی آپس میں رشتے نہیں کیا کرتے۔ پھر زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے خود امّی کی شادی سنّیوں میں ہوئی ہے۔ یعنی میرے والد سنّی ہیں۔ لیکن امّی سب سے یہی کہتی ہیں کہ امام باڑے میں جا کر پنجتن پاک کی قسم کھالی تھی۔

آج تک ہمارے رشتے اپنے دُدھیال سے خوش گوار نہیں۔ ہمارے ددھیال والے آج بھی ہمیں راوٗزن کی بیٹی کہتے ہیں۔

اب پتہ نہیں امّی کو کیا ہو گیا ہے، امتیاز کا نام آتے ہی خاندان کی ناک کی دہائی دینے لگتی ہیں۔ گویا ناک گوشت پوشت کا حصّہ نہ ہو کر موم کا کوئی ٹکڑا ہے، جسے جب جس کا جی چاہے گا آکر ٹیڑھا کر دے گا۔ ثُمن نے غصے میں سوچا لعنت ہے ایسی زندگی پر اگر میں امتیاز کی نہیں بن سکی تو کسی کی بھی نہیں بن سکوں گی۔ میں ربڑ کی بے جان گڑیا یا گھر کا بیکار فرنیچر نہیں ہوں کہ جس کے ساتھ میں چاہے گا فروخت کر دیا جائے گا۔ میں امتیاز کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گی ہرگز بھی نہیں۔ اس نے قلم اُٹھایا اور امتیاز کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

ڈیر امتیاز!

آج بہت مجبور ہو کر تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ امّی اور ابوّ کے فیصلے سے تو تم آگاہ ہو ہی گئے ہوں گے۔ میں چاہوں تو گھر سے بھاگ کر تمھارے ساتھ اپنی علیحدہ دنیا بسا سکتی ہوں۔ مگر میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ محبّت اور پیار کا رشتہ بڑا مقدّس ہوتا ہے۔

اس مقدس رشتے کی بنیاد میں غلط اینٹوں پر نہیں رکھنا چاہتی۔ ممکن ہے کل میری شادی زبردستی کسی اور کے ساتھ کر دی جائے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے تمھیں اپنا تسلیم کر چکی ہوں۔ اب میرے جسم پر تو کسی دوسرے شخص کا اختیار ہو سکتا ہے، لیکن میرے دل، میرے دماغ پر تمھارا اختیار رہے گا۔ میں کسی اور کی بانہوں میں رہ کر تمھارے تصوّر سے لپٹا کروں گی۔ تم سمجھ سکتے ہو کیسے کرب اور اذیت میں مجھے ایک بنٹی ہوئی زندگی جینے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں خدارا مجھے تو صرف ایک راستہ سوجھتا ہے۔ آج کی رات ہم آخری شب کے ہمسفر ہوں گے۔ میں آخری مرتبہ تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ خودکشی کرنا حرام ہے۔ پتہ نہیں دل سے کتنی بار میں نے تمھیں اپنا شوہر تسلیم کیا تھا لیکن سماج اور مذہب ثبوت مانگتا ہے۔ سماج میں رہنے کے لیے نکاح کے تین الفاظ پڑھنا ضروری ہے۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے نا! زبان سے تین الفاظ ادا کر کے آپ عمر بھر کے لیے کسی کی بیوی بن جاتی ہیں۔ چاہے آپ کا دل اس مرد کو قبول ہی نہیں کرتا ہو، پھر بھی وہ آپ کا شوہر ہو گا۔ اور پھر اسی طرح مرد تین الفاظ ادا کرتے ہیں اور آپ ان کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باہر ہو جاتی ہیں۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ مجھے تو وہی ایک راستہ نظر آتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا۔

تم آ رہے ہو نا...... ٹھیک ۹ بجے ندی والے پُل پر ملنا، میں تمھارا انتظار کروں گی۔

سُمن نے آخری مرتبہ اس گھر کی جانب حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اسی گھر کی آنگن کی مٹی میں وہ کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ یہ رات کی رانی اسی نے لگائی تھی۔ یہیں وہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ آیس پائیس کھیلتے ہوئے نیم کے درخت کے پیچھے چھپ جاتی تھی۔ اور یہیں بڑے ہو کر جھر جھر گرتی نیم کی پتّیوں کو بار بار جھاڑو سے سمیٹتے ہوئے وہ اس پیڑ کو کوسا کرتی تھی۔ اب قبر کا اندھیرا ہو گا اور وہ ہو گی جہاں منکر نکیر سوال کریں گے۔ پڑھو پانچوں کلمے، بہت یاد کرنے کے باوجود اسے صرف تین کلمے ہی یاد ہوئے تھے۔ اور اس بات کو لے کر وہ کافی فکر زدہ بلکہ خوف زدہ رہتی تھی۔ پتہ نہیں تھا اتنی جلدی مرنا پڑے گا۔ ورنہ وہ یقیناً تمام کلمے یاد کر لیتی۔ اس کا ضمیر بار بار اسے ملامت

کر رہا تھا کہ جو قدم وہ اٹھا رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس کے سامنے امّی کی سوجی آنکھیں گھوم گئیں۔ وہ رو رو کر ماتم کر رہی تھیں — ہائے میری ثمن مجھ سے روٹھ گئی۔ ابوّ بیچارے خاموش سے سفید کپڑے پہنے کونے میں کھڑے ہوں گے۔ ان کا چہرہ کالا پڑ گیا ہو گا۔ ابوّ کبھی روتے نہیں ہیں۔ انھیں آج تک کسی نے بھی روتے نہیں دیکھا۔ بس جب کسی عزیز کا انتقال ہوتا ہے یا وہ غم زدہ ہوتے ہیں تو ان کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

میرے مرنے پر سبھی غم زدہ ہوں گے سوائے میری چھوٹی بہن کے۔ اس سے میری آج تک کبھی نہیں پٹی۔ ہم دونوں نے ہزار مرتبہ تجھے موت آئے آدھی رات کو تیرا ہنڈہ جائے کی بددُعائیں دی ہیں۔ یہاں راجستھان میں میّت کے ساتھ جو گیس کی لالٹین روشنی کے لیے لے جاتے ہیں، انھیں ہنڈہ کہتے ہیں تو وہ تو بڑی خوش ہو گی۔ میری جائداد میں چھوڑے گئے کپڑے، درجن بھر چوڑیاں اور آرٹی فیشیل جویلری اس کے حصّے میں آئیں گی۔ پھر اسے یاد آیا بغل کے مکان میں رہنے والی حامدہ بیگم کا، جو تمام محلے کی لڑکیوں پر نظر رکھتی تھیں، وہ کس قدر چٹخارے لے کر اس کی موت کا ذکر کریں گی — لگی ہو گی کسی یار سے، دن چڑھ گئے ہوں گے۔ ورنہ یوں بلا وجہ تو کوئی نہیں مرتا۔ بیچاری امّی کو تمام دنیا کی باتیں سُننی پڑیں گی۔ لیکن وہ کیا کرے امّی نے ہی اسے یہ راستہ اختیار کرنے کو مجبور کیا ہے۔

اس کے قدم بے اختیار ندی والے پل کی جانب بڑھنے لگے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا محبّت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ جب وہ پل پر پہنچی تو امتیاز پہلے سے ہی اس کا منتظر تھا۔ ثُمن اس کی کشادہ چھاتی پر اپنا سر رکھ کر بے اختیار ہچکیوں سے رونے لگی — مجھے اپنے مرنے کا تو بالکل غم نہیں ہے۔ فکر ہے تو یہ کہ امّی ابوّ کا کیا ہو گا۔ انھیں کیسے کیسے تانے سہنے پڑیں گے۔ امتیاز تم میرے مرنے کے بعد میرے امّی ابوّ کا خیال رکھو گے نا۔ میں تمھیں ان کا نگراں اور محافظ بنا کر جا رہی ہوں۔

کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔ امتیاز نے ثمن کو مزید اپنی بانہوں کے شکنجہ میں کستے ہوئے کہا — کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمھارے بغیر زندہ رہ سکوں گا۔ نہیں ثمن ہرگز بھی نہیں۔ ہم اگر جئیں گے تو ایک ساتھ اور مریں گے تو ایک ساتھ — لیکن ثُمن بس روئے

جا رہی تھی جیسے وہ کچھ بھی نہیں سن رہی ہو — ثمن پلیز ...... میری ایک بات سنو۔ کیا ہمارا پیار اس قدر کمزور ہے کہ زمانے کے حوادث کی تاب بھی نہ لا سکی۔ حیرت کا مقام ہے کہ تم اتنی جلدی ناامید ہو گئیں۔ جانتی ہو ناامیدی کفر ہے۔

سنو یار اب چپ ہو جاؤ۔ میں نے ایک بہت ہی اچھی ترکیب سوچی ہے۔ تم اپنے گھر والوں کے نام کوئی خط لکھ کر چھوڑ آئی ہو۔ ثمن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاں ایک خط لکھ کر میز پر چھوڑا تو تھا — یار یہ اخبار والے دوست کس دن کام آئیں گے۔

دوسرے دن تمام شہر کے اخباروں میں ایک ہی خبر تھی ...... دو محبت کرنے والوں کا دردناک انجام۔ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، سونی مہیوال کی صف میں ثمن اور امتیاز کے نام بھی شامل ہو گئے ...... ندی کے پل پر صرف ان دونوں کے کپڑے ملے تھے۔ کافی کوششوں کے بعد بھی پولیس کو ان دونوں کی لاشیں نہیں مل تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ پانی کے تیز بہاؤ میں آگے نکل گئی ہوں گی۔

گاڑی طوفانی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی ...... چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک چھک ساتھ میں بھاگا جا رہا تھا زمین، آسمان، پیڑ سڑکیں اور راستے۔

یہ سیکنڈ کلاس کا ایک عام سا کمپارٹمنٹ ہے۔ جس میں ایک حسین دوشیزہ کے ساتھ ایک نوجوان محو گفتگو ہے۔ دوشیزہ کچھ غمزدہ سی ...... پریشان نظر آ رہی ہے۔ جبکہ نوجوان بہت خوش اپنے آپ میں مگن اور ایک حد تک لاپروا ہے۔

اوفوہ ثمن ...... تم اس قدر کیوں پریشان ہو رہی ہو! میں نے جو راستہ چنا ہے۔ وہ یقیناً ہم دونوں کے لیے صحیح ہے۔ تم ذرا تصور کرو۔ ایک مہینے کے بعد جب ہم واپس لوٹیں گے تو ہمارے خاندان والے، جنھوں نے ہمیں مردہ سمجھ کر صبر کر لیا ہو گا۔ ہمیں اچانک زندہ سلامت دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے۔ وہ یقیناً ہماری اس گستاخی کو معاف کر دیں گے۔ دیکھنا وہ ہمارے خوش حال مستقبل کے لیے بہت سی دعائیں دیں گے، اتنی ساری۔ امتیاز نے ہاتھ پھیلا کر کہا — کہاں چھپاؤ گی اتنی خوشیاں ثمن بی بی؟ وہ دانتوں میں انگلی دبا کر ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کی باتوں پر یقین کرنا چاہ رہی ہو اور اسے تھوڑا تھوڑا یقین آ بھی رہا تھا۔

بس اب ہنس بھی دو مجھے روتی بسورتی دُلہن قطعی پسند نہیں ہے۔ تم تو آخری شب کا ہم سفر بننا چاہتی تھیں نا...... ؟ لیکن میں نے تو تمھیں ساری زندگی کی ہم سفر بنالیا ہے۔ اب میری زندگی کی ہر شب...... ہر دن...... اور ہر لمحہ تمھارا ہے...... صرف تمھارا......

ریل اپنی تمام تر رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔ اپنی منزل کی جانب گامزن...... ہر چیز کو ٹھوکر مارتی...... پیچھے چھوڑتی...... چھک چھک...... چھک چھک...... چھک چھک...... چھک چھک...... اور اتنی ہی تیزی سے بڑھ رہے تھے امتیاز اور سُمن کے حسین جذبات، ان کے خواب، ان کی معصوم سی تمنائیں۔

ان کی تشنہ آرزوئیں...... ان کی خواہشیں۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ امتیاز کہہ رہا تھا — اودے پور پہنچ کر ہم فوراً نکاح کرلیں گے۔ وہاں میرا ایک دوست ہے۔ اس سے بات ہوگئی ہے۔ وہ ہماری پوری مدد کرے گا۔

تم اپنے ساتھ دُلہن کا لباس لائی ہونا۔ امتیاز نے پوچھا — ہاں چند زیور بھی لائی ہوں۔ کیا میں ابھی پہن لوں! پگلی امتیاز نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ابھی سے بڑا شوق ہے دلہن بننے کا ابھی تو ڈھائی گھنٹہ ہے۔ اوہ اوں...... بتاؤنہ وہ ٹھنکنے لگی...... پہن لوں...... وقت بچے گا...... بس جاتے ہی چٹ منگنی پٹ بیاہ...... ٹھیک ہے بابا جاؤ پہن لو۔

اور سُمن باتھ روم سے لال جوڑا پہن کر باہر نکلی تو واقعی دلہن لگ رہی تھی۔ اس نے امّی کے چند زیور بھی رکھ لیے تھے۔ اس نے سوچا تھا مرنے سے پہلے ایک مرتبہ امتیاز کو دلہن بن کر ضرور دکھائے گی۔ لڑکیاں تو خیر بچپن سے ہی دُلہن بننے کے سپنے دیکھتی ہیں۔ لیکن امتیاز کو بھی اسے دلہن کے روپ میں دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

امتیاز اسے دیکھے جارہا تھا اور وہ شرمائی شرمائی سی نظر جھکائے بیٹھی تھی۔ جیسے واقعی اس کی شادی ہوگئی ہو۔ لیکن یہ کیسی شادی تھی۔ جس میں اس کے کسی نے ابٹن نہیں لگایا۔ مائیوں نہیں بٹھایا...... کسی نے ہاتھوں میں مہندی نہیں سجائی۔ سات سہاگنوں

نے اس کے سر پر سایا کر کے لال چندوہ تانیو۔ گر جن لاگا برن لاگا نہیں گایا۔ کسی نے بنایَ نہیں گایا...... اس کی رخصتی پر میراثن نے بابل نہیں چھیڑا۔ کاہے کو بیاہی بدیس رے لاکھیا بابل موہے۔ یہ بابل سن سن کر وہ سبک سبک کر روتی تھی کہ کبھی پردیس میں شادی نہیں کرے گی۔ اور جب میراثن ہم تو ہیں بابل کھونٹے کی گیاّ گاتی تو گائے کی پوری شخصیت اس کی آنکھوں میں گھوم جاتی۔ ظالم ساس نے اسے گائے کی طرح کھونٹے سے باندھ دیا ہے اور وہ امّی کو یاد کر کر کے رو رہی ہے۔

کبھی کبھی اسے شادی سے شدید نفرت سی ہو جاتی تھی۔ شوہر مجازی خدا ہے۔ اس کا حکم بجالاؤ...... اس کو خوش رکھنا مرد کا فرض نہیں ہے۔ ہر روز کھانا بناؤ، میاں کے لیے سجو، اس کے کپڑے دھوؤ...... اس کے جوتے صاف کرو۔ وہ سوچتی کھانا بنائے گی میری جوتی...... کپڑے دھوئے میرا اٹھینگا؟ بڑا آیا مجازی خدا۔ ایسی کی تیسی، ہر روز نئی نویلی دلہنوں کو جلادینے اور اخبار میں عصمت دری کے واقعات پڑھ کر اس کا جی چاہتا تھا تمام مردوں کو لائن سے لگا کر گولی مار دے۔ بیچ چوراہے پر انھیں پھانسی پر چڑھادے۔ اسے لگتا تھا اس جیسی باغی لڑکی کو امتیاز سے محبت کیسے ہو گئی۔ وہ خوشی خوشی دوڑ کر اس کا حکم بجالانے کو تیاّر رہتی تھی۔ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا تو اس نے بھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔ مٹھائی سے اسے نفرت تھی لیکن امتیاز میٹھے کا عاشق اور چیوٹنا تھا۔ جی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے خوش رکھنے کے لیے مٹھائی کھالیتی تھی۔ حالانکہ بعد میں اس کا جی الٹی کرنے کو چاہتا تھا۔ لونگ وہ نہیں پہنتی تھی اس کی امّی پہننے بھی نہیں دیتی تھیں، کہتی تھیں کنوّاری لڑکیاں لونگ پہن کر دائی لگتی ہیں۔ لیکن امتیاز بغیر لونگ کے دلہن کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے چند دن پہلے اس نے ناک چھد والی تھی۔ حالانکہ بہت درد ہوا تھا۔ گھی اور ہلدی لگانے کے باوجود ناک پک گئی تھی۔ لیکن اس نے پھر بھی برداشت کیا۔ شاید جسے پیار کیا جاتا ہے اس کے لیے سب کچھ برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اسی لیے بیویاں میاوؤں کی کئی ناگوار باتیں سن کر بھی انھیں میں گھُستی ہیں۔

وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وہ اپنی سیٹ سے نیچے گر پڑی...... ابھی وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے

ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ گاڑی کو نیچے کی سمت دھنستا ہوا محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے وہ بڑی تیزی کے ساتھ نیچے گر رہی ہے۔ پورے کمپارٹمنٹ کے مسافر بُری طرح سے چیخ چلاّ رہے تھے۔ کسی کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اسی زبردست شور شرابے کے درمیان ایک آواز اُبھری...... کوئی کہہ رہا تھا— ریل جس پل پر سے گزر رہی تھی وہ پل اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں کمپارٹمنٹ ٹوٹ کر ندی میں غرق ہو گیا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ بہت سے مسافروں کو سخت چوٹیں آئیں تھیں۔ کئی افراد کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا تھا کئی لاشیں پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی آگئی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی لاش کے جسم پر سرخ جوڑا تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ نئی نویلی دلہن تھی۔ سب اس دلہن کے متعلق جاننے کے لیے بے چین تھے۔ مگر ہر مسافر اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کر رہا تھا۔ غوطہ خور زخمی افراد اور لاشوں کو نکال نکال کر بہ ذریعہ ایمبولینس ہاسپٹل بھجوا رہے تھے۔ ایک غوطہ خور اس لال جوڑے میں ملبوس لاش کو بھی گھسیٹ کر کنارے پر لے آیا۔ ابھی وہ دوسرے زخمیوں کی طرف متوجہ تھا کہ اس لال گٹھری میں ہلچل ہوئی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ لڑکی جو بھی تھی اس میں چند سانسیں باقی تھیں۔ دوسرے افراد کی طرح اسے بھی ایمبولینس میں ڈال کر ہاسپٹل پہنچا دیا گیا۔ ثمن کے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ بظاہر وہ نارمل تھی لیکن اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ابھی تک اسے امتیاز کے متعلق کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔

اس کی والدہ والد سب ہاسپٹل میں اس کے ساتھ تھے۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سب نے اس کے اس قصور کو معاف کر دیا تھا۔ لیکن اس کی امّی بھی یہی سوچتی تھیں کہ امتیاز اس ایکسیڈینٹ میں کہیں مر کھپ گیا ہو تو کتنا اچھا ہو۔ جہاں ثمن اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگتی تھی وہیں امّی امتیاز کے کبھی نہ لوٹنے کی دُعائیں مانگتیں۔

آج ثمن کو ڈسچارج کیا جانا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اب پھر وہی آنگن ہوگا، وہی امّی ابوّ اور بہن بھائی لیکن اس کی محبّت، اس کی چاہت کہاں ہوگی۔ اس کا دل کہتا تھا امتیاز زندہ ہے۔ ایک دن وہ اُس کے پاس ضرور آئے گا۔ اسے اپنی دلہن بنانے، یہی سوچتے سوچتے

ٹہلتے ہوئے وہ اب ہاسپٹل کے جنرل وارڈ سے گزر رہی تھی۔ وہ کاٹیج وارڈ میں داخل تھی۔ جہاں صاحبِ حیثیت ہی اپنا علاج کرواتے ہیں۔ یکا یک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی اور دماغ میں بجلی سی کوندگئی۔ وہ امتیاز جیسا ہی لگتا تھا۔ بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی، ہاتھ میں فریکچر اور سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی۔ اللہ تیرا شکر ہے تونے میری محبت کو زندہ رکھا۔ یقیناً وہ امتیاز ہی تھا۔ دوسرے ہی پل وہ اس کے پاس تھی اور بے اختیار اسے چوم رہی تھی ـــ میری جان تم زندہ ہو، میں جانتی تھی وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ تم یہیں تھے اور میں تمھیں تلاش نہیں کرسکی۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔ وہ بس ہمیشہ کی طرح اسے ٹکر ٹکر دیکھے جارہا تھا۔ اس وقت پانچ بجے تھے اور ہر روز شام کو ڈاکٹر اسی وقت راؤنڈ لینے آتے تھے۔ ڈاکٹر ماتھر نے اس سے پوچھا آپ ان کی کون لگتی ہیں؟ جی میں ان کی بیوی ہوں۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا ـــ او آئی سی لیکن میڈم آپ اب تک کہاں تھیں؟ کیا آپ نہیں جانتیں کہ ہم نے ان کو بڑی مشکلوں سے بچایا ہے اور ایک حد تک یوں کہیے کہ موت کے منہ میں سے چھین کر لائے ہیں ـــ جی ڈاکٹر صاحب دراصل میں خود بھی اس حادثے میں زخمی ہوگئی تھی۔ اس کے متعلق کوئی خیر خبر اسی لیے نہیں لے سکی ـــ کمال ہے آپ دونوں ایک ہی ہاسپٹل میں تھے پھر بھی ایک دوسرے سے نہیں مل پائے۔

ہوں کمال تو ہے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی ـــ ڈاکٹر صاحب یہ کب تک ٹھیک ہوجائیں گے ـــ حادثے میں ٹرین کی کھڑکی کے شیشے ان کے دماغ میں گھس گئے تھے۔ ان کا آپریشن کردیا گیا ہے۔ تقریباً ایک ہفتے بعد آپ انھیں یہاں سے لے جاسکتی ہیں۔

جی بہتر ہے...... اب بولنے کی باری امتیاز کی تھی ـــ جان میں سمجھتا تھا کہ اس خطرناک حادثے نے تمھیں مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کردیا ہے۔ میں زخمی تھا اس لیے کہیں تلاش نہیں کرسکا۔ ہمارا کمپارٹمنٹ تو پورا پانی میں غرق ہوگیا تھا۔ ہمارا بچ جانا واقعی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔

اب بولیے سمن بی بی کیا ارادے ہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے ہم اس سماج اور اپنے

خاندان سے ڈر کر کہیں نہیں بھاگیں گے اور ڈنکے کی چوٹ پر شادی کریں گے۔ کب کریں گے شادی آج اسی وقت پر یہیں ہو گی اور براتی ہوں گے ڈاکٹر، نرسیں اور مریض۔

سمن نے وہیں سے ڈاکٹر ماتھر کو فون کیا۔ تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے اُن سے مدد مانگی۔ ڈاکٹر ماتھر خوشی خوشی اس کے لیے تیاّر ہو گئے۔ فوراً قاضی صاحب کا انتظام کیا گیا۔ آج فرش پر فینائل کی جگہ عطر چھڑکا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں جرنل وارڈ آئینے کی طرح دمک رہا تھا۔

سمن کے والد والدہ اب بھی خوش نہیں تھے لیکن انھوں نے شاید حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ نکاح ہو گیا تھا اور اب سب مریضوں کو شیرنی تقسیم کی جا رہی تھی۔ میاں امتیاز کے سر پر سہرے کی جگہ سفید پٹّیاں سجی تھیں تو دلہن بیگم بھی سادہ کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ نکاح کے بعد امتیاز کو سمن نے اپنے کاٹج وارڈ میں منتقل کروالیا تھا۔ سمن کے امّی ابوّان سے اپنے گھر جلدی آنے کا اصرار کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ اب دولہا دولہن کمرے میں اکیلے تھے۔

نیا جنم مبارک ہو...... تمھیں بھی سمن نے امتیاز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

یار اس آخری شب کے ہم سفر بننے کے چکرّ میں ہم نے کتنے پاپڑ بیلے ہیں—— ہاں بیلے تو ہیں لیکن دیکھو ہم ایک دوسرے کے شریکِ سفر اور اب شریکِ حیات بن ہی گئے ہیں۔ اُمیّد پر دنیا قائم ہے۔ آلویز تھنک پازیٹو............ اچھا سوچو گے اور اس کے لیے دل سے دُعا بھی کرو گے تو اچھّا ہی ہو گا۔ اب تم کیا سوچنے لگیں؟ ہنی مون کے بارے میں ہم کہاں جائیں گے؟—— اودیپور جھیلوں کی نگری میں—— ہاں وہاں کی خوبصورتی کے متعلّق میں نے بہت سنا ہے۔ پچھولہ جھیل، فتح ساگر، گلاب باغ...... بس یار اب تم پھر سوچنے لگیں، تو آج سے ہم ایک نئی زندگی کی شروعات کریں گے اس زندگی میں ہمارے پاس عزیزوں کی محبّت نہیں ہے۔ اچّھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ بھی نہیں ہے لیکن ہمارے پاس اعتماد ہے جو آج تک ایک دوسرے پر کیا ہے۔ وعدے ہیں جو آج تک نبھائے ہیں۔ اُمیّدیں ہیں، جن کے سہارے ہم زندہ رہے، بچھڑے اور

پھر ملے۔ ہم دونوں کس قدر خوش نصیب ہیں۔ ہمارے پاس وہ ہیرے جواہرات ہیں جو کوئی چرا نہیں سکتا۔ ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں ہم سفر بننے کا وہ یقین ہے جسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ وہ ایک دوسرے میں گم لپٹے ہوئے اعتماد، یقین، محبّت اور...... بے شمار اُمیدوں کے سائے تلے، نئے راستوں کی جانب دھیرے دھیرے گامزن تھے

□
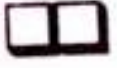
صبح کے انتظار میں

ان دِنوں موسم میں کافی ٹھنڈک ہے۔ فضا میں ہر سو فروری کی پیلی پیلی دھوپ پسری ہوئی ہے۔ میرے چھوٹے سے لان میں دیوار پر لپٹی ہوئی جوہی میں سفید نرم و نازک پھول مہک رہے ہیں۔ اس کی خوشبو سارے گھر میں اڑتی پھر رہی ہے۔ میرے بعد اس کو کون دیکھے گا، کون پانی دے گا، کون سنبھالے گا۔ آدمی جس گھر میں رہتا ہے وہاں کی ہر چیز سے اسے والہانہ محبت ہوتی ہے۔

مجھے یاد آتا ہے، جب میں ہندوستان سے یہاں آئی تھی تو یہ شہر کس قدر اجنبی لگتا تھا۔ ان دنوں میں سارا وقت ننھے کی دیکھ بھال میں گزارا کرتی تھی۔ اکثر میں اور جلال بازار جا کر گھر کی ضروریات اور آرائش و زیبائش کا سامان خرید کر لاتے تھے۔ اپنے اس گھر کے لیے صوفہ، فرج، ٹی وی سے لے کر چمچے اور چاقو کی خرید تک کے پیچھے میری خوبصورت یادیں چھپی ہوئی ہیں۔ میری زندگی کا بہترین سرمایہ، میرے ہر ایک سفر کی ہم سفر۔ اپنی اس زندگی میں مجھے ان یادوں اور اپنی کتابوں سے حد درجہ عشق رہا ہے۔ یہ یادیں اور کتابیں آدمی کو کبھی دھوکہ نہیں دیتیں۔ اس بے رحم دنیا میں میں نے رشتے، ناتے، پیار محبّت سب کو بدلتے اور کوڑیوں کے مول بکتے دیکھا ہے۔ اپنی گذشتہ زندگی میں جب بھی میں زیادہ پریشان اور حراساں ہوئی تو انھیں کتابوں کے آغوش میں پناہ لی ہے۔ میں تو انھیں بھول کر اپنی رنگین دنیا میں کھو گئی تھی۔ میں سوچ رہی تھی جوُہی کے متعلق، جوُہی کی اس بیل نے میرے گھر کی دیواروں کو پوری طرح ڈھک لیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح گیارہ سال پہلے جلال کی شخصیت نے مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لیا

تھا۔

امّی کس قدر سچ کہتی تھیں، محبّت آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ وہ ہم سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لیتی ہے۔ مجھ سے بھی اس محبّت نے میرے تمام حواس چھین لیے تھے۔ مجھے اس وقت ایک شخص کو پانے کی دُھن سوار تھی۔ ہر وقت اسی کے خیالات میں کھوئے رہنا، پہروں اسے لے کر مستقبل کے خواب سجانا۔ حالانکہ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی کہ امّی ابوّ کبھی اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں گے۔ ہمارے سماج میں شادی شدہ مردوں سے نہ محبّت جائز ہوتی ہے نہ شادی حالانکہ یہ اصول صرف عورت کے لیے ہیں مردوں کے لیے نہیں۔ آج مجھے لگتا بھی ہے سماج نے یہ جو اصول بنائے ہیں۔ وہ ہماری بہتری کے لیے ہی بنائے ہیں۔ میں نے ان اصولوں سے انحراف کیا۔ نتیجہ میرے سامنے ہے۔ کیا بچا ہے میری زندگی میں اب! جوانی کے دس بیش قیمتی سال میں نے اس شخص کے لیے برباد کر دیے اور پایا کیا؟ اس گھر میں اپنے گھر کو چھوڑ کر آئی تھی خالی ہاتھ اور آج خالی ہاتھ ہی واپس لوٹ رہی ہوں۔

یاد آتے ہیں ماضی کے وہ دن جب میں ہمیشہ پس و پیش میں پڑی رہتی تھی۔ ایک طرف جلال تھا دوسری طرف چھوٹے بھائی بہن اور والدین۔ ایک شخص کو اپنانے کے لیے مجھے اتنے لوگوں کو چھوڑنا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اس ایک شخص میں دنیا کی تمام خوشیاں سمائی نظر آتی تھیں۔ وہ مجھے اپنا ماضی، حال، مستقبل سب کچھ نظر آتا تھا۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے امّی ابوّ کی ناراضگی کے باوجود جلال سے شادی کرلی۔ لیکن میری محبّت پانی پر بنا ہوا نقش ثابت ہوئی۔ ان گیارہ سالوں میں محبّت بھری سرگوشیوں نے چیخوں کا روپ لے لیا ہے۔ پیار سے بولنے والی زبان سے غلیظ اور گندی گالیاں نکلتی رہتی ہیں۔ وہ ہاتھ جو کبھی زلف سنوارنے کے لیے اٹھتے تھے۔ اب جسم پر تیل ڈالنے کو بے قرار رہتے ہیں۔ وقت انسان کو فرشتے سے وحشی بنا دیتا ہے اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا۔ مجھے شاید ماں باپ کی نافرمانی کی سزا مل رہی ہے۔ میں نے اپنے پانوٗ تلے خاندان کی عزّت کو کچل دیا تھا، آج میں جلال کے ذریعہ ٹھوکروں میں ٹھکرائی جا رہی

ہوں۔

اس انجان اجنبی شہر میں کوئی بھی میرا ہمدرد نہیں ہے۔ جس کے آنچل میں منہ چھپا کر رو سکوں۔ زندگی میں بہت سے فیصلے کر کے انسان پچھتاتا ہے، روتا ہے، گڑگڑاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر گذشتہ وقت پلٹ کر آجائے تو وہ ایسی غلطی پھر کبھی نہیں کرے گا۔ مگر وقت ہے کہ لوٹ کر کبھی آتا ہی نہیں بلکہ اپنی رفتار کی لہروں سے دل کو دکھانے کے لیے یادوں کا ایک بکراں سمندر چھوڑ جاتا ہے جس سے دل کبھی پریشان ہوتا ہے، کبھی خوش اور کبھی زار و قطار روتا ہے۔ کوئی بھی شخص جب اپنوں سے بچھڑ جاتا ہے تو اس کا ماضی ہی اس کا سہارا ہوتا ہے۔ ماضی کی یہ یادیں ہی اندھیرے دُھندلکوں میں جگنو کا سہارا ہوتی ہیں۔ جب ہم اپنے آپ سے بیزار ہوتے ہیں تو زندگی سے فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ خودکشی کرلوں مگر بار بار اپنے خون اور گوشت سے بنے بیٹے کا چہرہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ میرے اس طرح موت کو گلے لگانے سے وہ سوالات کے دائروں میں گھر جائے گا۔ یوں بھی ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے۔ لیکن مذہب میں تو اور نہ جانے کیا کیا حرام ہے؟ دھرم کے تمام اصول صرف عورت کے لیے ہیں۔ اسے ہی ہمیشہ ان اصولوں کو ماننے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ کبھی مجبوری، کبھی لاچاری اور کبھی زبردستی کا چولا پہنا کر سماج اس سے ہمیشہ اپنے جائز اور ناجائز مطالبے منواتا آیا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ عورت ہے۔

میں نے کتنی محبّتوں سے اس گھر کو بسایا تھا۔ کل شاید اس گھر کے لیے میں اجنبی بن جاؤں گی۔ اس گھر میں کل ایک نئی مالکن آجائے گی۔ جلال کی نئی بیوی جو دراصل دو سال پہلے ہی اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ کس قدر بے وقوف تھی میں جو جان ہی نہیں پائی کہ جلال کی بے رُخیوں نے رنگینیوں کے راستے ڈھونڈ لیے ہیں۔ میں تو یہ بھی سمجھ نہیں پائی کہ میرا قصور کیا ہے؟

جلال کے مطابق اگر میں اس گھر میں رہنا چاہتی ہوں تو مجھے گونگا، بہرہ اور اندھا بن کر رہنا ہوگا اور اگر میں جلال کو چھوڑ دیتی ہوں تو سماج اور خاندان کو کیا منہ دِکھاؤں گی؟ یہ کوئی نہیں مانے گا کہ میں اپنے شوہر کو چھوڑ کر آئی ہوں۔ بھلا ایک عورت کی یہ

جسارت کہاں۔ایک چھوڑی ہوئی عورت کا ٹھپّہ لے کر جینا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے،اس کا احساس اپنے خاندان میں طلاق شدہ پھوپھی، خالاؤں کی بیچارگی کو دیکھ کر اندازہ لگا چکی ہوں۔ یہاں رہتی ہوں تو زندگی جہنّم سے بھی بدتر ہوگی۔ اس گھر کی ہر اینٹ میں میرے جذبات میری محبّت شامل ہے۔لیکن جب جیتا جاگتا شوہر ہی کسی غیر کا ہو گیا تو ان بے جان چیزوں کا کیا موہ کرنا۔

میں کیا کروں خدایا۔ ہر راستہ آج مجھے بند نظر آرہا ہے۔ کہاں جاؤں اپنے والدین اور بھائی کے علاوہ،اس دُنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ کیا کروں۔ یہ سوچتے سوچتے شہلا نڈھال سی ہو گئی تھی۔ رشتے بنانا کتنا آسان ہوتا ہے لیکن انھیں نبھانا بہت مشکل اور توڑنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔ سامنے الماری میں اس کی پیاری کتابیں جو اُسے جان سے زیادہ عزیز تھیں قرینے سے بجی ہیں۔وہی کتابیں جن پر گندگی اور تڑے مُڑے ورق دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ جاتا تھا۔ چھوٹے بھائی کی اکثر عادت تھی۔ جہاں پین دیکھا اور اس کے اندر کا فنکار جاگ اُٹھتا تھا۔ آڑی ترچھی لکیریں، گولے، پھول اور پتّیاں، میری کتابوں پر اس کے مصوّرانہ نقش بکھرتے رہتے تھے۔اپنے کام سے فارغ ہو کر بڑے اہتمام سے وہ کتابوں کو دوبارہ شیلف میں رکھ دیتا تھا۔ جیسے کسی غیبی طاقت نے اس سے یہ سب تصویریں بنوادی ہوں۔اپنی غریب کتابوں کے اس حال پر میں آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی۔ کبھی بلیڈ سے صاف کرتی، کہیں ربڑ رگڑتی تو کہیں اریزر سے ان کی بگڑی ہوئی شکل سنوارنے کی کوشش کرتی۔ اس کا لکیریں کھینچنا، میرا رونا اور رودھو کر کتابوں کو سنوارنا ہمیشہ جاری رہتا تھا

آج میری زندگی کے کینوس پر جلال نے اَن چاہی تصویریں بنادی ہیں۔ لیکن آج میرے پاس کوئی ربڑ اریزر یا بلیڈ نہیں بچا جو میں ان تصویروں کو کھرچ کر ہٹا سکوں۔ اس وقت میرے ہاتھوں میں بنگلا دیش کے ایک رائٹر کی کتاب ہے۔ جس میں ”مائی فیوڈل لارڈز“ کا شعری ترجمہ لکھا تھا۔ میری نظریں اس پر پھیلنے لگیں۔

وہ تمھاری شام کی چائے میں زہر ملادے گا۔

وہ تمھارے گلے میں رسّی باندھ کر۔

آم کے پیڑ پر لٹکا دے گا۔
یا سیلنگ فین سے ٹانک دے گا۔
وہ گروہ باندھ کر تمھاری عصمت دری کرے گا۔
وہ چلتی ٹرین کے نیچے تمھیں دھکیل دے گا۔
وہ تمھارے جسم پر کیروسین ڈال کر آگ لگا دے گا۔
پھر بھی تمھیں جینا ہوگا۔
وہ انسان نہیں مرد ہے۔

مجھے لگتا ہے اس شہر میں ایسا کوئی مرد نہیں ہے جو اعتبار کے قابل ہو۔ میں نے اپنے پیروں کو دیکھا۔ ایک لمبے جیون کا سفر کیا یہ تنہا طے کر پائیں گے۔ اگر پھر کسی ساتھی یا ہم سفر کی تلاش میں رہے تو انھیں لہو لہان کر دیا جائے گا۔ جلال اگر دوسری شادی کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے لیکن اگر میں دوسری شادی کے متعلق سوچتی ہوں تو یہ عیاّشی ہے۔ مجھے لگتا ہے اب اور جلال کا سہارا لینے کی کوشش کی تو وہ مجھے اس قابل بھی نہیں چھوڑے گا کہ میں کسی راستے پر چل سکوں۔ یوں بھی دو مرتبہ شوہر کا حق ادا کرتے ہوئے وہ مجھے بسترِ مرگ پر پہنچا چکا ہے۔

میں نے دوسری کتاب اٹھائی پاکستان کی ایک ادیبہ کا شعری مجموعہ، میں پھر پڑھنے لگی:

عورت یہ دُنیا تمھاری ہے۔
اس دنیا میں تم اپنی خواہش سے جیو۔
یہ دنیا اگر ایک آسمان ہے۔
تم پورے اس آسمان میں گھومتی پھرو۔
زندگی اگر تمھاری ہے، جو در اصل تمھاری ہی ہے۔
تو یہ زندگی تم اپنی خواہش سے جیو۔
عورت تم اپنا حق خود حاصل کرو۔
زندہ رہو عورتوں اور اچھی طرح زندہ رہو۔

آخر زندگی کے ان گھنگھور اندھیروں میں میری کتابوں نے ہی مجھے راہ دکھائی۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی اس گھر پر آخری نگاہ ڈالی۔ میں اس شہر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ یہیں رہوں گی اور اسی شہر میں جلال سے علیحدہ رہ کر اپنا حق حاصل کروں گی۔ میں نے اپنی تمام کتابیں اٹھائیں میری ڈگریاں، مارک شیٹس اور سارٹیفکیٹ، اب جو زندگی مجھے گزارنی ہے اس میں یہی میرے ہم سفر ہوں گے۔ میں جانتی ہوں سماج مجھے اچّھی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ جلال مجھے بد چلن کہے گا۔ لیکن یہ زندگی میری ہے اور مجھے حق ہے کہ میں اپنے لیے فیصلہ کر سکوں۔

امریتا پریتم کی یہ لائنیں ذہن میں گونج رہی تھیں:

عنبر کی ایک پاک صراحی
بادل کا ایک جام اُٹھا کر
گھونٹ چاندنی پی ہے ہم نے
بات کفر کی کی ہے ہم نے

میں کتابوں سے بھرا بیگ اور ننھے کا ہاتھ پکڑ کر ایک انجانی اَن دیکھی منزل کی جانب چل پڑی ہوں۔ رات کا آخری پہر ختم ہو رہا ہے اور سورج اندھیروں کا سینا چیر کر اُجالا پھیلانے ہی والا ہے۔ مجھے بھی امید ہے یہ راستہ جس منزل پر جا کر ختم ہوگا وہاں ایک نئی صبح میرے انتظار میں کھڑی ہوگی۔

□□

خاموش محبّت

ٹرن ٹرن ٹرن ٹرن...... باجی فون بج رہا ہے اٹھاؤنا۔ ذہین نے اپنی بڑی باجی یاسمین سے کہا جوادائے ناز سے صوفے پر پسری ہوئی تھی۔ ٹرن ٹرن باجی پلیز اٹھالو نا— میں نہیں اٹھاتی تمھارے پیروں میں کیا مہندی لگی ہے— لاٹ صاحب، کام چور کہیں کی ذہین منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی آگے بڑھی ...... کون صاحب بول رہے ہیں؟ میں بول رہا ہوں۔ بھئی میں کون؟ نام بتائیے اپنا؟ اجی نام میں کیا رکھا ہے یہ بتائیے آپ کون بول رہی ہیں؟ آپ کو اس سے کیا مطلب میں کوئی بھی بول رہی ہوں؟ آپ کو کس سے بات کرنی ہے۔ آپ بتا رہے ہیں یا میں فون بند کردوں۔ اُدھر سے آواز آئی— اجی ہمیں تو آپ ہی سے بات کرنی ہے۔ کون ہے ذہین؟ پتا نہیں باجی یہ کون احمق ہے جو اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے یہ کہہ کر ذہین نے رسیور رکھ دیا۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی پہنچی تھی کہ فون پھر بج اُٹھا۔ اُف اب کون آمرا۔ ہلو۔ ذہین نے جھنجھلا کر کہا۔ ارے ارے میں بہرہ نہیں ہوں۔ فرمایئے۔ میں نے کہا نہ مجھے آپ ہی سے بات کرنی ہے۔ اچھا تو آپ وہی ہیں احمق۔ جی درست فرمایا آپ نے۔ ویسے خاکسار کو اطہر کہتے ہیں۔ اللہ اطہر بھائی آپ بڑے خراب ہیں اچھا بتایئے آپ کب آئے۔ ۲۵ر سال ہوگئے محترمہ۔ اوفوہ میں پوچھ رہی ہوں اس شہر میں کب آئے۔ بس ابھی دس منٹ ہی ہوئے ہیں۔

اچھا تو ابھی فون پر آپ ہی تنگ کر رہے تھے۔ ہاں۔ اطہر نے کہا۔ بھئی تم تو پہچان ہی نہیں سکیں یہ تمھارا نام ذہین کس نے رکھ دیا تم میں تو ذہانت والی کوئی بات ہے ہی

نہیں۔اچھا آپ گھر تشریف لایئے گا۔ پھر ملے گا آپ کو میری ذہانت کا ثبوت۔ ٹھیک ہے میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔یہ کہہ کر اطہر نے فون رکھ دیا۔ ہائے بجیا اطہر بھائی جان آرہے ہیں بڑے مزے آئیں گے میں امّی کو خبر کردوں یہ کہہ کر ذہین دوڑتی ہوئی کچن میں پہنچی۔

اُف اس قدر کیوں دوڑ رہی ہو زمین بدُعا دے گی۔امّی نے کڑھائی نیچے اُتارتے ہوئے کہا—امّی اطہر بھائی آرہے ہیں۔اچھا......امّی نے خوش دلی سے کہا۔ جا تو لڑکی ذرا کمرہ درست کردے۔

اوں آپ ہر کام مجھے ہی کیوں بتاتی ہیں، بجیا کو بھی تو کہا کریں وہ مہارانی تو سنتے ہی پہلے باتھ رُوم میں گھس گئیں۔ اطہر بھائی کو رجھائیں گی بن سنور کر کام چور۔اطہر کے آجانے سے یاسمین ذہین بہت خوش تھیں اطہر سب کے لیے کچھ نہ کچھ لائے تھے یاسمین یہ میک اپ بکس میں تمھارے لیے لایا ہوں یہ ساڑی خالہ امّی کے لیے اور یہ شرٹ عادل کے لیے۔ میرے لیے کیا لائے ہیں اطہر بھائی ذہین نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ یہ کنگھوں کا سیٹ لایا ہوں دن بھر اپنے جھاڑ جھنکاڑ بالوں کو سلجھاتی رہنا ذہین کے بال گھنے اور گھنگرالے تھے اطہر اسے اکثر اس بات پر چھیڑا کرتا تھا۔

اطہر بھائی آپ بڑے خُراب ہیں نہیں لینے مجھے آپ کے کنگھے ونگھے بجیا کو تو میک اپ بکس لادیا۔ذہین یاسمین تو گوری ہے وہ میک اپ کرے گی تو اچھی لگے گی اور تم بھلا اس شامِ اَودھ پر سرخی پاؤڈر کیا اچھا لگے گا۔اس بات پر یاسمین اور اطہر کے ملے جلے قہقہے فضا میں گونج اُٹھے۔ذہین پیر پٹکتی ہوئی بیڈروم میں گھس گئی— پتا نہیں بجیا اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں گوری ہیں تو کیا ان کا ناک نقشہ تو اچھا نہیں ہے سفید بندریا کام چور کہیں کی۔ ذہین بیچاری ہر نماز میں دُعا مانگتی اللہ میاں مجھے گورا بنادے اور میرے بال بھی سیدھے کردے بجیا کو تو تو نے رنگ بھی گورا دیا ہے اور اُن کے بال بھی تو نے کیسے بنائے ہیں سیدھے گڑیا کی طرح یہ سب کیسے میرا مزاق اُڑاتے ہیں اللہ کرے بجیا کالی ہوجائیں۔ آمین ثم آمین اس نے آنکھیں بند کرکے دُعا مانگی۔

آج سب پکنک پر جارہے تھے یاسمین صبح سے ہی تیاری میں لگی تھی حسبِ معمول

کھانے اور ناشتے کا ذمہ ذہین کا تھا اس نے اچار، پراٹھے، کباب اور کچھ نمکین سب ٹفن میں پیک کر دیا تھا اور اب تیار ہونے کے لیے کمرے میں آگئی تھی۔ کیا پہنوں سفید سوٹ پہن لوں آج کل سفید کپڑوں کا خوب فیشن ہے—— چلو بھئی! دیر ہو رہی ہے۔ بس اطہر بھائی ابھی آئی۔ ذہین نے دُور ہی سے ہانک لگائی جیسے ہی ذہین کمرے سے باہر نکلی یاسمین نے ایک زور دار قہقہہ بلند کیا کیوں بجیا کیا میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں جو مجھے دیکھ کر ہنس رہی ہو۔ اطہر ذرا دیکھو تو بیگم کو۔ کیا ہوا بھئی، اور اطہر بھی ذہین کو دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بھئی تمھیں یہ قیمتی مشورہ کس نے دیا تھا کہ آج سفید سوٹ زیب تن کرو۔ کیا تمھارے پاس اور کوئی کپڑے نہیں؟ کیوں ان میں کیا بُرائی ہے؟ بھئی اپنے رنگ کی مناسبت سے کپڑے پہنا کرو۔ جاؤ اچھے بچّوں کی طرح کپڑے بدل لو۔ اطہر نے کہا نہیں میں نہیں بدلوں گی کپڑے، مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ دفع ہو جایئے بجیا کو لے کر وہ ہیں نا گوری چٹی گھمایئے انھیں اپنے ساتھ۔

ایک دھماکے کے ساتھ اس نے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ بہت دیر تک اپنے کمرے میں پڑی ہچکیوں سے روتی رہی: اللہ میاں یہ سب مجھے کیوں ستاتے ہیں کیا میں واقعی اتنی بدصورت ہوں۔ حالانکہ اس کی سہیلیاں ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ دراز قد گداز جسم اور ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک اور گلابی ہونٹ اس کا شمار اچھی خاصی خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا تھا بس اس کا رنگ ہی ذرا سا نولا تھا وہ اس کی وجہ سے گھر بھر کے لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنتی رہتی تھی۔

بچپن سے ہی یاسمین اور ذہین کی صورت اور سیرت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یاسمین کو اپنے گورے رنگ پر بہت ناز تھا وہ ایک خود پسند لڑکی تھی اسے خانہ داری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے برخلاف ذہین ایک سیدھی سادی سی لڑکی تھی، بچپن سے آج تک یاسمین ہر میدان میں اس سے فوقیت حاصل کرتی آئی تھی۔ ذہین دل ہی دل میں اطہر کو چاہتی تھی مگر اسے لگ رہا تھا کہ بجیا محبّت کے میدان میں بھی اس سے ہمیشہ کی طرح میدان مار لے جائیں گی۔ ذہین ارے بھئی کہاں ہو ذرا چائے تو دینا آج تو بہت تھک گئے۔ اطہر نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ہوں! چائے بنائے گی میری جوتی،

گھومنے گئے تھے۔ وہاں بھی تھک گئے جناب۔ زہر بنا کر پلادوں گی چائے کی جگہ، لگتا ہے کوئی آرہا ہے ذہین نے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کرلیں جیسے سو رہی ہو۔ ذہین نے دیکھا اطہر اندر داخل ہو رہے تھے وہ آنکھیں بند کیے چپکی پڑی رہی۔ لگتا ہے سو گئی پاگل لڑکی۔ اس کا جی چاہا کہہ دے پاگل ہوں گے آپ خود مگر وہ سوتی بنی رہی وہ کچھ دیر بغور اُسے دیکھتے رہے پھر چلے گئے۔

وہ صبح چائے بنا رہی تھی کہ اطہر کچن میں آگئے۔ ذہین چائے بن گئی کیا؟ جی ہاں۔ مگر یہ کالا سوٹ کیوں پہن رکھا ہے آج جہاں تک مجھے معلوم ہے ہمارے گھر میں سب زندہ ہیں۔ کیوں؟ کیا اب مجھے کپڑے بھی آپ کی اجازت سے پہننے ہوں گے۔ ذہین نے جل کر کہا، پھر یہ کالا رنگ میرے مقدّر اور میری رنگت سے بہت میل کھاتا ہے اب تو خوش ہیں نہ آپ ذہین کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر گئے۔ اطہر نے کچھ جواب نہ دیا بس مسکراتے ہوئے اُسے دیکھتے رہے۔

آج خوب بارش ہو رہی تھی چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا تھا۔ بجیا چلو ناؤ، ناؤ کھیلیں۔ ٹھیک ہے پہلے میں ناؤ بناؤں گی۔ یاسمین نے کہا۔ یہ سفید کاغذ کی میری اور لال والی تمھاری اے یہ لو سفید ناؤ تیزی سے پانی کے بہاؤ پر چل پڑی پیچھے پیچھے لال ناؤ تھی۔ ذہین دل ہی دل میں دُعا مانگ رہی تھی اللہ میاں میری ناؤ بجیا کی ناؤ سے آگے نکل جائے۔ یکایک ایک جھونکا آیا اور لال ناؤ آگے نکل گئی۔ ذہین کا دل بلّیوں اُچھل گیا مگر دوسرے ہی پل ناؤ ذرا آگے جا کر ڈوب گئی جبکہ بجیا کی ناؤ اب بھی بڑی تیزی سے پانی پر دوڑ رہی تھی۔ لو تم ہار گئیں آخر کار جیت میری ہی ہوئی نا۔ یاسمین نے فخر سے کہا۔

ذہین ایسے ہی عجیب عجیب کھیل کھیلتی تپتی دوپہری میں اوپر چھت پر کبوتروں کو دانہ ڈالنے پہنچ جاتی اور پھر اللہ میاں سے دُعائیں مانگنے لگتی —— اللہ میاں اگر داہنے ہاتھ کی مٹھی والا دانہ کبوتروں نے پہلے کھایا تو اطہر کی شادی بجیا سے ہوگی اور بائیں ہاتھ والا دانہ پہلے کھایا تو اطہر میرے ہوں گے۔ کبوتر بھی ایسے کمبخت پہلے داہنے ہاتھ کا دانہ کھاتے اب تو وہ بالکل نااُمید ہو چکی تھی۔ ذہین اکثر اپنے کمرے میں بند رہتی دُنیا جہان سے بے خبر وہ تھی اور اس کے شکستہ خواب۔ اطہر بھائی اور بجیا کی شادی کے چرچے

زوروں پر تھے وہ بے جان بُت کی طرح خاموش رہتی۔

کل اطہر بھائی جارہے تھے۔ امّی سے انھوں نے کہہ دیا تھا کہ گھر پہنچ کر خط کے ذریعہ وہ بتائیں گے کہ شادی کس دن رکھی جائے۔ اطہر بھائی چلے گئے اور پیچھے چھوڑ گئے تنہائیاں اور محرومیاں۔ بجیا پر آج کل بہار آئی ہوئی تھی وہ بے چینی سے اطہر بھائی کے خط کا انتظار کرتی رہتیں۔ آخر اطہر کا خط آہی گیا بجیا نے لپک کر دس کا نوٹ پوسٹ مین کو انعام میں دیا اور خط کھول کر پڑھنے لگیں وہ جیسے جیسے خط پڑھتی جاتی تھیں ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑتا جاتا تھا۔ امّی وہ ایک زوردار چیخ مار کر گر پڑیں۔

کیا ہوا میری بچّی۔ یاسمین میری بیٹی ...... امّی میں برباد ہوگئی۔ یاسمین نے روتے ہوئے کہا دیکھیے اطہر نے کیا لکھا ہے۔ ذہین ذرا پڑھنا میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی میں نے بے دلی سے خط اُٹھایا مجھے لگا اطہر کی تحریر میرا منہ چڑھا رہی ہے پھر بھی میں نے پڑھنا شروع کیا۔

"خالہ امّی آداب!

آپ میرے جواب کا انتظار کررہی ہوں گی دراصل میں کچھ کہنا چاہتا ہوں یاسمین کو کبھی میں نے اپنی دُلہن کے روپ میں نہیں دیکھا ہاں وہ میری ایک اچھی دوست ضرور ہے میں تو اپنے لیے ایک سانولی سلونی لڑکی چاہتا ہوں جس کے چہرے پر بلا کی پاکیزگی ہو جس کے الجھے الجھے بال ہوں اور جس کی آنکھوں میں ہمیشہ نمی تیرتی رہتی ہو بس مجھے اس سے ہی محبّت ہے آپ سمجھ گئی ہیں نا؟ اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو میں بارات لے کر آرہا ہوں اپنی خاموش محبّت کو اپنانے خالہ امّی میری دُلہن کا خیال رکھیے گا وہ بہت حساس ہے۔ ہاں اس سے کہیے گا کہ خبردار جو اَب کالے کپڑے پہنے میں لال جوڑا لارہا ہوں۔ اس سے آگے اس کی زبان کچھ نہ پڑھ سکی۔

وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور بے اختیار اپنے رب کو سجدہ کرنے کے لیے جھک گئی۔ اے میرے پاک پروردگار تو بڑا رحیم و کریم ہے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، میں تیرا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ "ذہین" اس نے سجدے سے نگاہ اٹھائی سامنے بجیا کھڑی تھیں۔ سرخ آنکھیں الجھے بال مگر چہرے پر بلا کا سکون اسے ان کی یہ

حالت دیکھ کر دلی صدمہ ہوا۔ ذہین خاموش محبّت کی یہ جیت تجھے مبارک میری گڑیا مجھے معاف کرنا میں نے ہمیشہ تیرا دل دُکھایا ہے۔ ذہین خاموشی سے اُنھیں دیکھتی رہی۔ آج بجیا یکا یک ہی اس کی نظروں میں عظیم ہوگئی تھیں۔

وہ سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں جیت کس کی ہوئی ہے میری یا بجیا کی۔ کیا وہ جیت کر بھی ہار گئی؟ آج پہلی بار بجیا کو وہ غمزدہ دیکھ رہی تھی اسے اِن کی حالت پر دلی افسوس تھا مگر دوسری طرف وہ خوش بھی تھی وہ سوچ رہی تھی کہ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت کو وہ کیا نام دے؟

□□

زندگی کے موڑ پر

ٹیکسی بہت تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی، شاہین کا دل بہت زور سے دھک دھک کر رہا تھا وہ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اے میرے پروردگار سب خیریت ہو۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے پر لگ جائیں اور وہ جلد سے جلد ہاسپٹل پہنچ جائے پتا نہیں کتنی چوٹیں ہوں گی نہ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ بار بار اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھّے ننھّے قطرے اُبھر آتے تھے۔ جنھیں وہ اپنے رومال سے جذب کرکے پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔ نہ جانے اُسے کیوں گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ حالانکہ موسم خاصہ خوشگوار تھا۔افق پر لدی پھندی گھٹائیں برسنے کو تیار تھیں۔

اس شام بھی تو موسم آج ہی کی طرح خوشگوار تھا۔وہ ابھی ابھی دفتر سے آئی تھی بس ہاتھ منہ دھو ہی رہی تھی کہ کال بیل بج اُٹھی۔

وہ ساڑھی کا پلو کمر سے لپیٹتے ہوئے اٹھی اور دروازہ کھولا تو احمر تھے۔اوہو آج تو میم صاحب جلدی گھر آ گئیں۔ ہاں آج دفتر کے کلرک سے لفٹ لے لی تھی۔ انھوں نے خود ہی کہا تھا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر انکار نہیں کیا کہ برسات سر پر کھڑی ہے، ایک بار برسنا شروع ہوگئی تو نہ جانے کب تھمے۔

چلو اچھا کیا۔ احمر جوتے کھولتے ہوئے بولا۔ واقعی بارش شروع ہو جاتی تو تمھیں یقیناً راستے میں کہیں ضرور رکنا پڑتا۔

اوہو جناب یہ اپنے پیچھے کیا چھپا رکھا ہے؟

ارے میں تو بھول ہی گیا۔ تمھیں سموسے بہت پسند ہیں نا، گرم گرم ہیں، آجاؤ

ساتھ ہی کھائیں گے۔

واہ بھئی واہ تم تو بڑے اچھے شوہر ہو۔ شاہین نے ایک قہقہہ لگایا۔ تم فریش ہو جاؤ میں ابھی چائے بنا کر لائی۔

کچھ ہی دیر میں وہ چائے بنالائی، دونوں گرم گرم سموسوں اور چائے کی چسکیوں کے بیچ باتیں بھی کرتے رہے۔

شاہین چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی ابھی شام کا کھانا بھی بنانا تھا۔ آج کام والی مہری بھی نہیں آئی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی پریشر ککر میں آلو اُبالنے کو چڑھا دیے آج تو آلو کے پراٹھے بنالوں احمر بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ جتنی دیر میں آلو ابلتے وہ آٹا گوندھنے لگ گئی۔

اتنے میں احمر بھی کچن میں آگئے۔ بھئی شنوّ کیا بنا رہی ہو۔ احمر اسے پیار سے شنوّ کہتے تھے۔ تمہارے پسندیدہ آلو کے پراٹھے۔ ارے واہ بھئی مزا آگیا واقعی یار تم بہت اچھی ہو۔ لگتا ہے آج موسم کے ساتھ ساتھ قسمت بھی ہم پر مہربان ہے۔ بھئی سچ تم بہت اچھی ہو اتنی اتنی کہ.........

بس جناب رہنے دیجیے شاہین نے ہنستے ہوئے کہا۔

احمر نے چمچا ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں کچھ مدد کروں؟ نہیں میں کرلوں گی۔ آپ تو ابھی تھکے ہارے آئے ہیں، آپ آرام کریے۔ تم بھی تو دفتر سے تھکی ماندی آئی ہو۔ بھئی یہ تو ناانصافی ہو گی کہ تم کام کرو اور میں آرام کروں۔ آج میں بھی گھر کے کام میں تمھاری مدد کروں گا۔ لاؤ میں آٹا گوندھ دوں۔ نہیں رہنے دو مجھے پتا ہے، وہ آٹا نہیں گھول بن جائے گا۔ اچھا تو میں تیل گرم کر دوں۔ نہیں تم اپنے ہاتھ پیر جلا لو گے۔

شنوّ بیگم۔ احمر نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ ہمیں اناڑی مت سمجھیے گا۔ ارے صاحب کہیں ہم سے ایسی خطا ہو سکتی ہے۔ شنوّ نے کہا۔ نہیں ہم تو آپ کو پیدائشی کھلاڑی مانتے ہیں۔ اچھا اب جاؤ مجھے کھانا بنانے دو۔ میں بھی ساتھ بنواؤں گا۔ اچھا ضد کرتے ہو تو یہ آلو چھیل دو میں اتنے میں پیاز تلتی ہوں۔

اس طرح پیار بھری نوک جھونک کے درمیان ان کے دن بڑے حسین گزر رہے تھے۔ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں احمر اس کا ہاتھ بٹنا دیتا تھا۔ گل ملا کر وہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب مانتی تھی کیونکہ دونوں کماتے تھے اس لیے گھر میں آرام و آسائش کا ہر سامان موجود تھا۔

اب تو انھوں نے ایک اسکوٹر بھی خرید لیا تھا۔ دن مزے سے گزر رہے تھے۔ صبح احمر اسے اسکوٹر پر دفتر چھوڑ دیتا تھا اور واپسی میں وہ بس یار کشا سے آجاتی تھی۔

آج صبح سے ہی شاہین کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، انمنے من سے وہ دفتر کی فائلیں دیکھ رہی تھی شام ہوتے ہوتے تو اس کا سارا جسم دُکھنے لگا۔ سر بھی بہت بھاری ہو گیا تھا، لگتا ہے بخار ہو گیا۔ اس نے فائلیں بند کر دیں اور سر ٹیبل پر جھکا کر بیٹھ گئی۔

مسز شاہین آفس بند ہو چکا ہے۔ کیا آج گھر جانے کا ارادہ نہیں ہے؟ اس کے ساتھی شرما جی پوچھ رہے تھے۔ شاہین نے خفیف سی آواز میں کہا، کیا دفتر کا وقت ختم ہو گیا؟ ہاں سب لوگ جا چکے ہیں۔ لگتا ہے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ جی ہاں، معمولی سا بخار ہو گیا ہے۔ تو آج آپ کو چھٹی کر لینی چاہیئے تھی۔ نہیں جب میں گھر سے چلی تھی تو بالکل تندرست تھی۔ چلیے میں آپ کو گھر پہنچا دوں اِس حالت میں آپ بس کا انتظار کریں گی۔ شکریہ شرما جی آپ تکلیف مت کریئے میں رکشا سے چلی جاؤں گی۔ کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔ تکلیف کچھ نہیں ہو گی، میرا تو وہی روٹ ہے۔ چلیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔ شرما جی فائلیں سمیٹتے ہوئے بولے۔ شاہین نے اپنا پرس سنبھالا۔ چلیے۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔ بڑے فرشتہ صفت آدمی ہیں۔ اچّھا ہوا لفٹ مل گئی ورنہ آج تو اتنی بھی ہمّت نہیں تھی کہ چل کر بس اسٹینڈ تک جاؤں۔

اس کا گھر آ گیا تھا، شکریہ شرما جی۔ شاہین نے ساڑھی سنبھالتے ہوئے کہا۔ آپ اندر آیئے نا چائے پی کر جایئے گا۔ نہیں مسز شاہین آج چائے کا تکلف رہنے دیجیے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں، میں پھر کسی دِن چائے پینے حاضر ہو جاؤں گا، ابھی آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ آپ کہیں تو میں آپ کی درخواست آفس میں دے دوں چھٹی کے لیے۔ نہیں میں احمر کے ذریعہ بھجوا دوں گی۔ آپ بالکل پریشان مت ہویئے۔ اس

میں پریشانی کیسی؟ آفس تو مجھے جانا ہی ہے۔ پریشانی تو بھائی صاحب کو ہو گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے، آپ فکر نہیں کریں درخواست میں دے دوں گا۔ احمر بھائی کو سلام کہیے گا۔ شرما جی نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

شاہین نے پرس میں سے چابی نکال کر دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔ لگتا ہے آج احمر جلدی گھر آگئے۔ وہ اندر داخل ہو گئی، سامنے ہی احمر بیٹھے تھے، کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے۔ آج آپ جلدی آگئے۔ ہوں، جاؤ جلدی سے چائے بنالاؤ۔ اوہ نو، پلیز اچھے احمر آج چائے تم بنالاؤ۔ میں بری طرح تھک گئی ہوں اور میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔

کیوں کیا پہاڑ پر چڑھ کر آئی ہو؟ جو تھک گئی ہو۔ مزے سے اسکوٹر پر بیٹھ کر آئی ہو۔ احمر نے بدمزگی سے منہ بناتے ہوئے کہا۔ میں نے بتایا نا احمر آج دفتر میں میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اچھا طبیعت خراب تھی تب بھی شرما جی سے ہنس ہنس کر باتیں ملنخار ہی تھیں۔ کون کر رہا تھا باتیں، میں تو صرف ان کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ واہ بھئی کیا اتنی دیر تک صرف شکریہ ہی ادا ہو رہا تھا۔ احمر نے غصہ سے کہا۔ میں ان سے اخلاق کے تحت چائے کے لیے پوچھ رہی تھی۔ بھئی بہت خوب تمھارے شوہر کو جب چائے کی طلب ہوتی ہے تو کہہ دیتی ہو کہ خود بنالاؤ۔ اور اپنے دوستوں کو تھکے ہونے کے باوجود چائے کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔

تمھیں چائے بنانے کی کہہ کر میں گنہگار بن گئی ہوں۔ آخر دو کپ چائے بنادو گے تو پہاڑ ٹوٹ جائے گا کیا سر پر؟ بجائے اس کے کہ تم مجھ سے میری طبیعت کے بارے میں پوچھتے اُلٹے مجھے جلی کٹی سنارہے ہو، سچ بات تو یہ ہے کہ تمھیں میرا شرما جی کے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا۔ میں جان بوجھ کر نہیں آئی تھی۔ مجبور تھی اس لیے لفٹ لینی پڑی۔ اور اگر تمھیں اپنی بیوی کا اتنا ہی خیال ہے تو خود اتنے وقت اسکوٹر پر مجھے کیوں نہیں لے آتے۔ ہاں اسکوٹر کا طعنہ تو تم مارو گی ہی کیوں کہ اس کی خرید میں تمھاری تنخواہ کے پیسے بھی تو شامل تھے۔ دراصل عورتیں جب نوکری کرنے لگتی ہیں تو ان کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔

احمر صاحب میں آپ کو یاد دلا دوں کہ نوکری میں نے اپنی مرضی سے نہیں کی تھی، تم نے مجھے فورس کیا تھا۔ مجھے پتا ہوتا کہ ایک دن اپنی افسری کا رعب تم مجھ پر جھاڑو گی تو کبھی کرنے نہیں دیتا۔

تمھیں میری نوکری سے اتنی ہی سخت جلن ہے تو چھوڑ دوں گی نوکری، دے دوں گی استعفیٰ۔

رہنے دیجیے شنو بیگم! یہ احسان عظیم مت کریے۔

احمر نے بڑے طنز سے کہا—ورنہ ہندوستانی عورت کی قربانیوں کے چرچے عام ہو جائیں گے۔

آخر تم چاہتے کیا ہو؟ نہ تم میرے نوکری کرنے سے خوش ہو اور نہ چھوڑنے سے۔ شاہین نے روتے ہوئے کہا۔ یہ ٹسوے کسی اور کے سامنے بہانا، مجھ پر تمھارے ان آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہو گا۔

یہ اسی احمر کے الفاظ تھے جو شاہین کے چہرے پر افسردگی دیکھتے ہی بیچین ہو جاتا تھا۔ جھک مار کر وہ خود ہی کچن میں گھس گئی۔ مہری کے ہاتھ چائے بھجوا کر وہ اپنے کمرے میں جا کر اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ کمرے میں سے دھیمے دھیمے کسی کے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔

پھر تو آئے دن کسی نہ کسی بات پر ان دونوں میں تکرار رہنے لگی۔ صبح سے شام تک وہ دفتر میں کام کرتی، پھر گھر آ کر صفائی، کپڑے دھونا، کھانا بنانا وغیرہ کیوں کہ مہری بھی اپنے گانوٗ چلی گئی تھی۔ اس لیے یہ ذمہ داری بھی اب اس کی تھی۔ اب احمر بھی پہلے والا احمر نہیں تھا۔ وہ باورچی خانہ میں جھانکتا بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی ساری شام کھٹتی رہتی۔ مسلسل کام کی زیادتی اور دماغی ٹینشن کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگی۔ اس کی صحت دن بدن گر رہی تھی۔ آئے دن کسی نہ کسی بات کو لے کر احمر اس سے جھگڑ پڑتا تھا۔

آخر جب دونوں ایک دوسرے سے بیزار رہنے لگے اور تلخیاں دن بدن بڑھنے لگیں تو پہل شاہین ہی نے کی۔

احمر یا تو تم عادتیں بدل لو، ورنہ مجھے لگتا ہے کہ اب ہمارا ساتھ رہنا فضول ہے۔

رشتے جب بوجھ بننے لگیں تو انھیں توڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ میں اس طرح گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتی۔

ٹھیک ہے مجھے بھی تمھارے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے اب ہمارا طلاق لینا ہی بہتر ہے۔ جب تک کاغذات تیاّر ہوں تم آزاد ہو، چاہے جہاں رہو۔

شاہین نے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ اپنے کپڑے نکالے۔ اب ساتھ رہنے میں فائدہ بھی کیا ہے؟ وہ سوٹ کیس لے کر دروازے پر رک گئی۔ شاید اب بھی احمر اسے روک لے۔ بڑی کربناک نظروں سے احمر کی طرف دیکھا، مگر وہ بدستور بے نیاز سا صوفے پر بیٹھا رہا۔

آج اُسے احمر سے الگ ہوئے پورے دو مہینے ہو گئے تھے۔ فیملی کورٹ میں طلاق کی عرضی دی ہوئی تھی جج صاحب نے فیصلہ سنانے سے پہلے انھیں ایک موقع عطا کیا تھا۔ انھوں نے تین مہینے بعد فیصلے کی تاریخ مقرّر کی تھی اور کہا تھا اس وقفے میں وہ اور سوچ لیں۔ وہ انھیں خیالات میں گم تھی کہ دروازے کی کال بیل بج اٹھی۔ دیکھا تو شرما جی گھبرائے ہوئے کھڑے تھے۔ بھابھی احمر بھائی کا ایکسیڈینٹ ہوگیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہیں اور شدید طور پر زخمی ہیں۔ شرما جی کا گھر احمر سے ذرا فاصلے پر تھا۔ جب سے شاہین نے گھر چھوڑا تھا، کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ احمر کے حادثے کی خبر سن کر اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ بھیّا ذرا جلدی چلاؤ نا، وہ ڈرائیور کو ہدایت دینے لگی۔

اسپتال آگیا تھا، شاہین نے پچاس کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا اور بھاگ کر اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائیور اُسے آوازیں دیتا رہا کہ بہن جی باقی پیسے تو لیتی جاؤ، مگر وہ اپنی دُھن میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

Which Is The Way To Emergency Please

اُس نے ایک ڈاکٹر سے پوچھا جو پاس سے گزر رہا تھا۔ تیسری منزل پر۔ ابھی ایک منزل اور چڑھنا ہے۔ اس نے ساڑھی ذرا سی اونچی کی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی اوپر چڑھ گئی۔ سامنے ہی سرخ الفاظ میں امرجنسی لکھا تھا وہ دھڑکتے ڈوبتے دل کے ساتھ اندر

داخل ہوئی۔ داہنے ہاتھ کی طرف ایک صاف ستھری بیڈ پر ایک مریض لیٹا تھا۔ غالباً نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ یقیناً وہ احمر ہی تھا اس کے ایک ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا تھا۔ سر کی پٹیوں سے بھی خون جھانک رہا تھا وہ دم بخود رہ گئی۔ آنکھوں میں کالے حلقے، سوکھا ہوا زرد چہرہ وہ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔ یس پلیز! ڈاکٹر اس کی طرف رجوع ہوا۔ جی میں مسز احمر ہوں۔ بے اختیار اس سے یہ الفاظ ادا ہوگئے۔ اچھا ہوا آپ آگئیں، ویسے یہ اب خطرے سے باہر ہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں انھیں تھوڑی دیر میں ہوش آجائے گا۔ سسٹر آپ انھیں وارڈ میں لے جایئے۔ شاہین گھبرائی گھبرائی سی اسٹریچر کے ساتھ چل رہی تھی۔

آہ۔ شاید احمر کو ہوش آرہا تھا۔ وہ اُٹھ کر سرہانے بیٹھ گئی۔

احمر، کیسے ہو تم۔ گھبراؤ نہیں انشاءاللہ جلد ہی صحت یاب ہو جاؤ گے، لو یہ جوس پیو۔ احمر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ تم کچھ نہیں بولو گے ڈاکٹر نے تمھیں مکمّل آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔

شاہین نے آفس سے ۱۵ دن کی چھٹیاں لے لیں تھیں آج احمر کو Discharge Certificate مل رہا تھا، ویسے تو وہ چل پھر سکتا تھا مگر ڈاکٹر نے پھر بھی احتیاط برتنے کی صلاح دی تھی۔

شاہین نے احمر کو ٹیکسی میں سے سہارا دے کر نیچے اُتارا۔ چلو میں تمھیں اندر تک پہنچادوں۔

اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جس گھر کو اس نے خیر باد کہہ دیا تھا۔ قسمت پھر اُسے اسی گھر میں لے آئے گی۔ اس نے گھر کے در و دیوار پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ کچھ بھی تو اجنبی نہیں تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھکانے پر رکھی تھی جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اُس نے اپنی شادی کی تصویر کو دیکھا جس پر مٹّی کی گرد جم چکی تھی۔ شاہین نے ایک سرد آہ بھری اور ساڑھی کے پلو سے گرد صاف کر کے اُسے سنگھار میز پر لگا دیا۔ اس نے چور نگاہوں سے احمر کی طرف دیکھا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ یک لخت وہ کہاں غائب ہو گیا اس سے تو ابھی پوری طرح سے چلا بھی نہیں جاتا۔

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ احمر اپنے ہاتھ میں ٹرے لیے ہوئے آ گیا۔ میں تمھارے لیے چائے بنانے گیا تھا۔ تم بھی پاگل ہو، چائے کی طلب تھی تو مجھ سے کہا ہوتا میں بنا دیتی تم کہیں گر پڑتے تو؟

شنو میں بالکل ٹوٹ چکا ہوں کیا تم اب بھی نہیں سمجھیں۔ اس کی نظروں میں ایک عجیب سی بیچارگی تھی۔ دیکھو تمھارے چلے جانے کے بعد میری کیا حالت ہو گئی ہے۔ شاہین چپ چاپ نیچی نظریں کیے ہوئی ساڑی کا پلو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں لپیٹتی رہی۔ تم نے بھی تو مجھے جاتے وقت نہیں روکا تھا۔ میں سخت شرمندہ ہوں کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ احمر نے شاہین کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ شاہین نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ پگلی رو کیوں رہی ہو، ٹھیک ہے، میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں لیکن شنو زندگی بہت چھوٹی ہے پھر کسی نہ کسی موڑ پر میں تمھیں ضرور ملوں گا۔ مرتے دم تک میری خواہش یہی رہے گی کہ کاش یہ زندگی تمھاری زلفوں کی چھاؤں میں بسر ہوتی۔

بس کرو احمر مجھے اور شرمندہ مت کرو، شاید کچھ غلطیاں میری بھی رہی ہوں گی۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارا گھر اجڑنے سے بچ گیا۔ چلو تو اسی بات پر چائے ہو جائے۔ مگر یہ تو ٹھنڈی ہو چکی تم بیٹھو میں ابھی گرم کر کے لایا۔ نہیں تم چائے بنا لائے تھے۔ اب گرم کر کے میں لاؤں گی۔ یہ کہتے ہوئے شاہین اُٹھ گئی۔ نہیں شنو آج تم آرام کرو۔ نہیں آرام تم کرو۔ اچھا ایسا کرتے ہیں کہ چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑے بھی تل لیتے ہیں، تو چلیں کچن میں۔ اور دونوں کے ملے جلے قہقہے کمرے میں گونج اُٹھے۔

□□

ایک خواب اور

اوفوّہ! یہ ساری ساڑھیاں جلدی سے پیک کردیں۔ بھئی شادی میں دو دن رہ گئے ہیں۔ امّاں بی کے چہرے سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو جوّاد کی دلہن کے لیے ساری دنیا ہی خرید لیتیں ایک سے بڑھ کر ایک ساڑھیاں اور زیور جگ مگ کرتی بری اور سوکھے میووں کے تھال ساری خواتین کی نظر بری پر جم کر رہ گئی تھی۔

امّاں بی نے بڑے ارمانوں اور اُمّیدوں کے ساتھ جوّاد میاں کی شادی کی تھی دلہن بھی کیا خوب تھی بالکل چاند کا ٹکڑا جہیز بھی لاکھوں کا لائی تھی امّاں بی تو پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ امّاں بی کی خاندانی رسم تھی کہ پہلے پہل دلہن سے کوئی میٹھی چیز بنوائی جاتی ہے تاکہ وہ زندگی بھر میٹھا بولے انھوں نے سوچا کہ دُلہن سے پہلی بار کھیر ہی بنوائی جائے۔ خیر سے دلہن کی شادی کو دو مہینے گزر چکے تھے۔ بوڑھی ہڈّیاں کہاں تک باورچی خانہ سنبھالتیں۔

ایک دن انھوں نے جوّاد میاں کو پاس بٹھا کر کہہ ہی دیا کہ بیٹا اب دلہن سے گھر گرہستی سنبھلواؤ۔ اتنا کہنا تھا کہ قہر برپا ہوگیا۔ دلہن بیگم آپے سے باہر ہوگئیں اور کہا کہ اے امّاں بی میں کوئی کسی گئے گزرے ماماؤں کے خاندان کی نہیں ہوں جو یہاں آکر روٹیاں سیکوں، ہمارے یہاں تو دس دس نوکر تھے ہماری امّی نے تو کبھی ہمیں باورچی خانہ کا منہ تک نہیں دیکھنے دیا۔ آپ بھی نوکر رکھ لیں اور اگر نہیں رکھ سکیں تو خود ہی بنالیا کریں مجھ سے پہلے بھی تو آپ کھانا بناتی ہی تھیں۔ بھئی! ہمیں تو کھانا کھانا آتا ہے بنانا نہیں۔ دلہن بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ کر دھڑ دھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

اماں بی بیچاری دن بھر باورچی خانہ میں گھسی رہتیں اور اپنے آپ کو کوستی رہتیں کہ میں کیوں بڑے گھر کی بیٹی کے خواب دیکھا کرتی تھی اپنی ہی طرح کسی متوسّط طبقے کی بہو لے آتی تو آج یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔ جوّاد میاں سدا کے بے وقوف، جورو کے غلام کبھی بیوی کو اُف تک نہ کہتے اور نہ ہی کبھی جیب ہلکی کر کے۔

اماں بی دن رات فکر میں گھُلتی رہتیں۔ آخر انھیں ایک راستہ سوجھ ہی گیا۔ بھئی کیوں نہ چھوٹے بیٹے عمّاد کی شادی کر دی جائے وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ عماد اماں بی کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ مگر اب انھوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ چھوٹی بہو کسی بہت غریب خاندان کی لائیں گی جسے خانہ داری کا بھی خوب تجربہ ہو، غریب ہونے کی وجہ سے وہ ذرا دب کر بھی رہے گی۔

تو جناب تلاش شروع ہوئی۔ اماں بی دن رات چھوٹی بہو کی تلاش میں سرگرداں رہتیں۔ کئی لڑکیاں دیکھیں لیکن کہیں بات نہ بن پاتی کہیں شکل آڑے آجاتی تو کہیں دوسری خصلتیں۔

ایک دن وہ اپنے کسی عزیز کے یہاں برکت نگر گئیں جاتے وقت عمّاد نے انھیں اسکوٹر پر چھوڑ دیا تھا واپسی میں انھیں ٹیمپو میں آنا تھا۔ شہر سے دُور ہونے کی وجہ سے وہاں اور کوئی سواری نہیں ملتی تھی۔ عمّاد کو کلینک پر بیٹھنا تھا اس وجہ سے وہ ٹیمپو کے انتظار میں کھڑی ہو گئیں۔ ان کے سامنے ہی ایک دُبلی پتلی سانولی سی کھڑے نین نقش والی لڑکی بھی کھڑی تھی ہاتھ میں دو تین کتابیں تھیں۔

اماں بی نے ایک اجنبی سی نظر ڈالی شاید کہیں پڑھتی ہو گی۔ کپڑوں سے تو کسی غریب گھر کی لگتی ہے۔ اماں بی اور کچھ نہ سوچ سکیں کیونکہ ٹیمپو آ گیا تھا ہر شخص جلدی میں تھا کہ پہلے وہ چڑھے۔ اماں بی کی کہاں دال گلنے والی تھی۔ ایک ریلا آیا اور وہ خود بخود ٹیمپو کے اندر ہو گئیں۔ تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے اور یہ مُوا کنڈکٹر اب بھی سواریوں کو بلا رہا ہے۔ مت ماری گئی ہے کمبخت کی کیا ہمارے سر پر بٹھائے گا۔ وہ لڑکی جو اُن کے ساتھ کھڑی تھی وہ سامنے نشست پر بیٹھی تھی۔ اماں بی کو یک لخت اُس سے بڑی جلن ہوئی مگر دوسرے ہی لمحہ میں وہ اسے دعائیں دینے لگیں کیونکہ اُس نے اپنی جگہ اماں بی کو بٹھا

دیا تھااور خود کھڑی ہو گئی تھی۔

اماں بی نے باتوں ہی باتوں میں اُس کا پتہ پوچھ لیا تھااور دوسرے ہی دن عمّاد کا رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ فاخرہ کے گھروالوں نے انھیں خاطر خواہ لیااور فوراً ہی رشتہ قبول کر لیا۔

بی فاخرہ دلہن بن کر اماں بی کے گھر آ گئیں بڑی بہو کی طرح اماں بی نے اس کے کوئی ناز نخرے نہیں اُٹھائے اور آٹھ دن بعد ہی اُسے گھر سنبھلوادیا۔ فاخرہ نے بھی بڑی خوش اسلوبی سے تمام کام سنبھال لیااور اماں بی نے چین کی سانس لی۔

وقت گزرتا گیااور اماں بی ایک چاند سے پوتے کی دادی بن گئیں۔ فاخرہ زچگی سے اُٹھی تو اس کے مزاج میں ایک عجیب سا چڑچڑا پن آگیا کوئی بھی کام دل لگا کر نہیں کرتی۔ اماں بی نے سوچا کہ یہ وقتی بات ہے وہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر فاخرہ کی خوبیاں نہ جانے کہاں کھو گئیں تھیں وہ دن رات اماں بی کو کوستی رہتی کہ بڑھیا ہماری جان کو بیٹھی رہتی ہے۔ بڑی بہو تو کچھ نہیں کرتی پھر ہم اپنی جان کیوں کھپائیں اور پھر فاخرہ نے ایک دن اماں بی سے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنا انتظام کر لیں اب آپ کا گزارا ہمارے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔

اماں بی بیچاری وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی تھیں۔ وقت کی آندھی انھیں پھر اُسی باورچی خانہ میں لے گئی تھی جہاں ان کی ساری زندگی دھواں دھواں ہو گئی تھی۔ ان کی آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ اسی چولہے کی نظر کر چکی تھیں۔

آج انھیں اپنے امّی ابّا پر سخت غصّہ آرہا تھا جنھوں نے انھیں یونہی جاہل رہنے دیا اگر آج وہ تعلیم یافتہ ہوتیں تو کسی چھوٹے موٹے اسکول میں بچّوں کو پڑھا کر اپنی زندگی گزار دیتیں کتنی بے وقوف تھیں ان کی امّی پھوپھی، خالہ جو ہر دم انھیں بس یہی دُعا دیتی تھیں کہ چاند سے بیٹوں کی ماں بنو دُودھو نہاؤ پوتوں پھلو۔

اُف یہ پھل کتنے کڑوے نکلے۔ کاش ان کے ایک لڑکی ہی ہوتی تو وہ ان کا کتنا خیال رکھتی۔ وہ اپنے امّی ابّا کا حشر میں دامن ضرور پکڑیں گی جنھوں نے ہمیشہ اُسے صرف بیٹوں

کی دُعائیں دیں۔ کاش بھولے سے کبھی وہ یہ بھی کہہ دیتیں کہ اللہ تجھے چاند سی بیٹی دے۔
مگر اُن کا بھی کیا قصور، انھوں نے خود بھی تو کبھی لڑکی ہونے کی دعا نہیں مانگی، وہ تو ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ اے ہے لڑکی کا کیا کرنا ہے مردار کو کھلا پلا کر بڑا کرو پھر شادی کرو خود تو جائے گی ہی ساتھ میں ہزاروں کا سامان بھی لے جائے گی۔

ہائے کتنی احمق تھیں وہ، خدا سے انھوں نے یہ نایاب تحفہ کیوں نہیں مانگا؟ مگر اب کیا ہی کیا جا سکتا تھا۔ اتنے ہی میں فرحان اسکول سے آ گیا آج اس کا ہائر سکنڈری کا آخری پرچا تھا۔

اماں بی نے آنسو پونچھے اور اُس کے لیے کھانا نکال لائیں۔ فرحان چپ چاپ کھانا کھا رہا تھا۔ اماں بی سوچ رہی تھیں تین سال بعد فرحان بی۔اے۔ ہو جائے گا پھر اور بیٹوں کی طرح اس کی بھی نوکری لگ جائے گی پھر اس کی بھی مجھے شادی کرنی پڑے گی مگر اب کی بار میں اس کی دلہن اپنے ہی خاندان سے لاؤں گی عزیز داری کا لحاظ تو رکھے گی۔ ان نگوڑیوں کی طرح نہیں جنھوں نے اپنے خصم کو مٹھی میں کر لیا ہے ماں کو تو بالکل ہی بھول گئے ہیں، نسیم آپا کی لڑکی فرحان کے لیے کیسی رہے گی۔

اماں بی اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی خلش بھول گئیں انھوں نے اپنی اشکوں سے بھیگی پلکوں پر ایک خواب اور سجا لیا۔

نسیم آپا کی لڑکی دُلہن بن کر بڑی اچھی لگے گی بس اس کی ناک ذرا موٹی ہے مگر کوئی بات نہیں اس کے پیر بڑے خوبصورت ہیں گداز گورے گورے جب پازیب پہن کر میرے آنگن میں چلے گی تو کتنا اچھا لگے گا۔ چھم چھم چھم چھم چھم چھم۔

□□

ہار جیت

موسم کتنا عجیب سا ہو رہا ہے۔ نہ تو پوری طرح کھُل کر دھوپ نکل رہی ہے اور نہ ہی ابر چھا رہے ہیں کیسی مریل پیلی پیلی سی دھوپ ہے۔ شام ڈھلنے والی ہے ہوا میں اب خنکی بھی بڑھ گئی ہے۔ ایسے موسم میں میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی کام نہ کروں بس چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھی رہوں اور کوئی دھیمی دھیمی سی اداس غزل سنتی رہوں۔ آج بھی حسبِ معمول میں نے گراموفون پر احمد فراز کی یہ غزل لگا دی:

اب کے بچھڑیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جیسے سوکھے ہوئے دو پھول کتابوں میں ملیں
ڈھونڈھ مت اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں
تو خدا ہے نہ ترا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو پھر کیوں حجابوں میں ملیں
اب کے بچھڑے .... ملیں

میری آنکھیں ماضی کے جھرونکوں سے نہ جانے کیا تلاش کرنے لگیں مہدی حسن کی خوبصورت اور مترنم آواز کمرے میں گونج رہی تھی:

اب کے بچھڑے .... ملے

اور یکا یک سوئی اسی ایک مصرعے پر آکر اٹک گئی:

شاید کبھی خوابوں میں ملیں
شاید کبھی خوابوں میں ملیں
شاید کبھی خوابوں میں ملیں

میری زندگی کی سوئی بھی تو یکایک آج سے ۱۲ برس پہلے ایسے ہی اٹک گئی تھی اس وقت سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور شبریز تم تو ایسے کھوئے کہ کبھی خوابوں میں بھی نہیں ملے مگر یہ آج مجھے کیا ہوا؟ میں تمھیں کیوں یاد کر رہی ہوں۔

تم نے ایک بار کہا تھا کہ "نیلو اپنی کاپیوں پر سے اب میرا نام کاٹ دینا۔" میں نے اپنی کاپیوں ہی پر سے نہیں بلکہ اپنی زندگی میں سے بھی تمھارا نام کاٹ دیا تھا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر محبّت کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔

مگر یہ مجھے آج کیا ہو گیا ہے، میں کیوں یادوں کی وادیوں میں کھو رہی ہوں، میرے سامنے تو ایک بہت بڑا مسئلہ آن پڑا ہے۔

بچے جب جوان ہو جاتے ہیں تو والدین کے لیے اکثر الجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ خاموش معصوم سی دکھنے والی لڑکی نازی اتنی جرأت کے ساتھ میرے سامنے آ کر یہ کہنے لگے گی کہ "ممی مجھے ریحان سے شادی نہیں کرنی ہے مجھے اسرار پسند ہے اور میں اسی سے شادی کروں گی۔ میری زندگی کا فیصلہ آپ کیسے کر سکتی ہیں۔ جو شخص مجھے پسند نہیں ہے میں اُس کے ساتھ پوری زندگی تو کیا ایک منٹ بھی رہنا گوارہ نہیں کر سکتی۔ آپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے اس لیے کہ میں اپنا بُرا بھلا خود سوچ سکوں۔ اس کی باتیں میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ میرا خون کھول رہا تھا میں نے اُسی وقت یہ طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اس لڑکی کی شادی ریحان سے ہی ہو گی آخر ہماری ناک کا سوال تھا برادری میں کتنی بدنامی ہو گی کہ ہم زبان دے کر مکر گئے۔ نازی کی پھوپیاں تو اکثر مجھے سناتی رہتی تھیں کہ لڑکی کو کون سی نوکری کروانی ہے جو ایم۔ اے کروا رہی ہو، بہت ہو چکا اب اس کو گھر سے رخصت کرو۔ وہ ہمیشہ نازی کی تعلیم کی مخالفت کرتی تھیں مگر میں اُن کی باتوں کو در گذر کر دیتی تھی۔

جس سماج میں ہم سانس لے رہے ہیں، لڑکیوں کا تعلیم یافتہ ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ ضرورت پڑنے پر اس تعلیم کو وہ اپنا ذریعۂ معاش بھی بنا سکتی ہیں اسی لیے میں نے نازی پر کبھی بے جا پابندیاں عاید نہیں کیں کیونکہ لڑکے یا لڑکی کا اچھا یا بُرا ثابت ہونا خود اس پر زیادہ منحصر کرتا ہے بہ نسبت اس کے ماں باپ کے۔

آج پھر مجھے اپنا زمانہ یاد آرہا ہے۔ نازی نے مجھے ماضی کی ان وادیوں میں دھکیل دیا ہے جنھیں میں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی یادوں پر کبھی گرد نہیں جمتی اور زخم کبھی بھرتے نہیں اس حقیقت کا انکشاف آج مجھ پر ہوا۔

میں بی۔اے۔ (فائنل ایر) کی طالبہ تھی آج ہماری الوداعی پارٹی تھی سارا ہال لڑکے لڑکیوں سے کھچا، کھچ بھرا ہوا تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں سب کی پسندیدہ شکیل بدایونی کی وہی غزل سناؤں:

اے مرے ہم نشین چل کہیں اور چل، اس چمن میں اب اپنا گذارا نہیں
بات ہوتی گلوں تک تو سہہ لیتے ہم، اب تو کانٹوں پہ بھی حق ہمارا نہیں

اور لوگوں کی طرح تمھیں بھی تو یہ غزل بہت پسند تھی مگر تم تو مجھے ہمیشہ کے لیے کانٹوں سے گذارہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ گئے الوداع والے دن جب ہم آخری مرتبہ ملے تھے تم نے کہا تھا کہ تم جلد ہی اپنی امّی کو ہمارے یہاں بھیجو گے۔

مجھے ڈر تھا کہ گھر والے کہیں میری شادی طے نہ کردیں کیونکہ کئی اور جگہ سے بھی پیغام آرہے تھے اور انھیں شادی کی بہت جلدی تھی۔ میں نے اپنے گھر میں تمھارے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا میں چاہتی تھی کہ پہل تمھاری طرف سے ہو۔

لیکن کئی دن گذر گئے اور تمھارے یہاں سے کوئی پیغام نہیں آیا ایک مرتبہ کچھ اڑتی اڑتی سی خبر میرے کانوں میں پہنچی کہ تمھاری امّی کسی موٹی آسامی کی تلاش میں ہیں جو جہیز میں لاکھوں کا سامان لائے۔

میں اپنے دل کو بہلاتی رہی کہ یہ سب جھوٹ ہے تم اس طرح بے وفائی نہیں کرسکتے لیکن جلد ہی میرا یہ بھرم ٹوٹ گیا۔ تمھارا ایک خط مجھے ملا جس میں تم نے اپنی مجبوری کا ذکر کیا تھا کہ تم اپنی امّی کی مخالفت نہیں کرسکتے اگر میرے ابو بھی جہیز میں ایسا اور اتنا ہی سامان دیں تو تم اپنی امّی کو منالو گے۔ میرے خواب میری آرزوئیں ہمیشہ کے لیے بکھر گئے تم اکثر گنگنایا کرتے تھے۔

سفر مریخ کا ممکن ہے زہرہ کے مخالف ہو
ستاروں کی اس گردش کو مل کر ٹالنا ہوگا

نہ ابھریں سوچ کی دیوار پہ کچھ اور تصویریں
سکونِ دل ہمیں ایک دوسرے سے مانگنا ہوگا

مگر تم سکونِ دل کی بجائے تمام عمر کے لیے میرے دامن میں بے قراریاں ڈال گئے، میں جہیز کی منڈی میں نیلام ہونے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی اگر میں چاہتی تو میرے ابوّ یقیناً میری خوشی کے لیے اپنے آپ کو بیچ کر بھی جہیز کا انتظام کر دیتے مگر میں خود غرض نہیں تھی، میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے ابوّ کی شخصیت قرض کے بوجھ تلے دب کر گم ہو جائے۔ کبھی کبھی زندگی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں نظر آتی ہے تو صرف ایک راہِ سمجھوتا۔ میں نے بھی زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

میں دلہن بن کر شعیب کے گھر آ گئی تھی روز مرّہ کی الجھنوں اور زندگی کے نشیب و فراز میں تمھاری یاد کہاں کھو گئی کب چاندی کے تاروں نے سر پر حکمرانی کر لی کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ مگر آج میرے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے، مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ ہم میں سے کون غلط ہے، نازی یا میں۔

وہ ایک شخص سے شدّت سے محبّت کرتی ہے، اُسے چاہتی ہے۔ اور چاہت پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ کیا ایک مرتبہ پھر سے تاریخ اپنے آپ کو دوہرائے گی؟ کیا نازی بھی میری ہی طرح ایک کرب آمیز دور سے گزر کر اپنی ذات کے دھندلکوں میں کھو جائے گی؟

نہیں میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی، میں اس کی آرزوؤں اس کے خوابوں کو پامال نہیں ہونے دوں گی۔ خدایا...... میں یہ کیا کرنے جا رہی تھی اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا بدلہ میں اپنی اولاد سے لینے جا رہی تھی۔

گراموفون اپنے آپ صحیح ہو گیا تھا اور اب غزل کا آخری شعر گونج رہا تھا:

اب نہ وہ میں ہوں، نہ وہ تو ہے، نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں نازی اور اسرار کو تمنّا کے سرابوں میں گم نہیں ہونے دوں گی۔ میرے سامنے نازی کا کِھلا ہُوا مسکراتا چہرہ آ گیا اور محبت کی ایسی جیت پر میں بے اختیار ہنس پڑی۔

□□

سائبان

اچانک ہی آسمان کالی کالی گھٹاؤں سے گھر گیا اور ٹین کی چھت پر مسلسل ٹپ ٹپ کی آواز کے ساتھ بوندیں برسنے لگیں۔ تہمینہ نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ یہ اچانک موسم کو کیا ہو گیا۔ یک لخت تبدیل ہو گیا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سی سانس بھری۔ اس زندگی میں سب کچھ اچانک کیوں ہو جاتا ہے؟ حالات اچانک تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اپنے اچانک بیگانے بن جاتے ہیں۔ حادثے اچانک رونما ہو جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟

اُسے یاد آیا اُس کی شادی بھی تو اچانک ہی برسات کے ایسے ہی برستے بھیگتے موسم میں عامر سے طے ہو گئی تھی۔ وہ بہت روئی تھی کہ پہلے اسے اپنی پڑھائی پوری کرنے دیں۔ ابھی تو اس نے صرف بی۔ اے ہی کیا ہے۔ مگر امّی ابوّ نے یہ کہہ کر کہ ایسے رشتے روز روز نہیں ملتے اُس کی ایک نہیں سُنی اور تہمینہ دوسری شریف لڑکیوں کی طرح چپ چاپ آنسو بہاتی سرخ جوڑے میں لپٹی لپٹائی عامر کے گھر دلہن بن کر آ گئی۔

جہاں وہ اپنے خوابوں کی نئی جنت سے آشنا ہوئی۔ جہاں اُس نے خوشیوں کے بے شمار لمحات گزارے مگر عارضی۔

اُسے یاد ہے، شادی کے ایک مہینے بعد ہی وہ کشمیر گئے تھے ہنی مون منانے۔ جہاں عامر نے بس سے اُتر کر کہا تھا تمھاری ہستی میرے لیے پیار کا رِم جھم برستا ساون ہے۔ تب تہمینہ کو خبر نہیں تھی کہ اس کی زندگی میں واقعی اشکوں کا ساون ٹھہر جائے گا۔

ایک بار جب وہ نشاط باغ گھومنے گئے تھے تو سامنے بہتے ہوئے جھرنے کو دیکھ کر عامر نے کہا تھا: "تہمینہ، میری زندگی میں ہمیشہ اس آبشار کی طرح موجزن رہو گی۔ مجھے قسم ہے تمھاری ان دراز زلفوں کی۔ میں رہتی دُنیا تک تمھارا رہوں گا، صرف تمھارا۔

کتنی نادان تھی وہ جو اس کی ہر بات پر اعتبار کر لیتی تھی۔

جب کشمیر سے لوٹے تو عامر کے تبادلے کے احکام جاری ہو گئے اور نئی گرہستی کو لے کر وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ عامر صبح ہی دفتر چلے جاتے اور وہ دن بھر گھر کو سنوارتی، کھانا بناتی اور پانچ بجتے بجتے اس کی آنکھیں دروازے پر اٹھ جاتیں۔ شروع میں عامر چھ بجے تک اکثر گھر آ جاتے تھے۔ اب یہ انتظار بڑھ کر دس بجے تک پہنچ گیا تھا۔ تہمینہ نے کئی بار شکایت کی تو جواب ایک ہی ملتا۔ دفتر میں بہت کام ہے۔

آج ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا، وہ صبح ہی عامر کو یاد دلائے گی۔ مگر صبح تہمینہ کا ارادہ بدل گیا۔ کیوں نہ انھیں سرپرائز دیا جائے۔ عامر جب آفس چلے گئے تو اس نے سارے گھر کو نئے سرے سے آراستہ کیا اور نئی گلابی ساڑھی زیب تن کی۔ عامر کا پسندیدہ رنگ۔

اس نے ایک ٹیکسی والے کو روکا اور عامر کے دفتر کا پتہ اسے بتا دیا۔ تہمینہ سوچ رہی تھی، آج کا دِن کہیں باہر گذارا جائے۔ ساری تلخیوں کو بھلا کر اسی بہانے کہیں کھانا کھایا جائے۔ زندگی میں کچھ تو نیا پن آئے گا۔

اُس نے ایک اُڑتی ہوئی سی نظر دفتر میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر ڈالی، عامر کی سیٹ خالی تھی، اس کے ایک دوست نے بتایا کہ وہ اپنی سیکریٹری کے ساتھ سامنے والے ریسٹورنٹ میں لنچ لینے گیا ہے۔ تہمینہ نے سوچا چلو وہیں مل لیتے ہیں۔ "سن شاین" ریسٹورنٹ، اس نے بڑے نفاست سے ساڑھی کا پلّو اپنے شانوں پر جمایا اور ایک طائرانہ نگاہ سے چاروں طرف دیکھا، مگر عامر اُسے کہیں نظر نہیں آیا۔ ابھی وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ دفعتاً ایک بیرے کو کیبن کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اُسے اندر عامر کی ذرا سی جھلک نظر آئی، یقیناً وہ عامر ہی تھا۔ تہمینہ نے لپک کر کیبن کا پردہ ہٹا دیا۔ سامنے جو منظر تھا وہ اس کے ہوش اڑا دینے کو کافی تھا۔ اُس نے خواب میں بھی

نہیں سوچا تھا کہ وہ جو اس کی دراز زلفوں کی قسم کھایا کرتا تھا۔ آج کسی اور کی تراشیدہ زلفوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے پردہ گرایا اور بھاگ کر کھٹکھٹاتی ہوئی ساری سیڑھیاں اتر گئی۔

گھر آکر تہمینہ گھنٹوں اپنے تکیہ میں منہ دیے روتی رہی۔ عامر نے اسے شادی کی پہلی سالگرہ کا کتنا حسین تحفہ دیا تھا۔ حسبِ معمول رات کو جب عامر گھر آیا تو فضا میں ایک نامعلوم سی تلخی گھلی ہوئی تھی۔ تہمینہ۔ عامر کی کرخت آواز کمرے میں گونجی، تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ اب تم اتنی گر گئی ہو کہ میری جاسوسی پر آمادہ ہو گئیں۔ عامر کی یہ باتیں سن کر اسے سخت تعجّب ہوا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے اپنے کیے کی معافی مانگے گا۔ مگر یہاں تو بازی ہی الٹ گئی تھی۔ عامر کی باتیں اس کے سر پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ ذلیل عورت تمھیں میرا احسان مند ہونا چاہیے، دو وقت کی روٹی دیتا ہوں میں تمھیں۔

روٹی دیتے ہو تو کیا احسان کرتے ہو۔ تہمینہ نے برجستہ جواب دیا۔ تم مجھے بیاہ کر لائے ہو، میں شرعاً تمھاری بیوی ہوں۔ اپنے فعل پر شرمندہ ہونے کے بجائے، تم مجھے ہی غلط ثابت کر رہے ہو۔ کیبن میں تم اس لڑکی کے ساتھ کیا کر رہے تھے،

میں مرد ہوں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔

بے غیرت تم جسے مردانگی کہہ رہے ہو، وہ عیّاشی ہے، بزدلی ہے۔ تڑاخ، تہمینہ کے گال پر ایک جھنّاٹے دار تھپّڑ پڑا۔ عامر اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے، میں تمھاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

تم مجھے اس گھر سے کیا نکالو گے، میں خود تمھارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم انسان نہیں وحشی ہو۔ تمھاری نظروں میں عورت کی عفّت، اس کی عظمت، اس کی وفا، اس کی شرافت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تم ان مردوں میں سے ہو جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ مگر میں کھلونا نہیں ہوں۔ مجھے ان جاہل عورتوں میں سے مت سمجھنا جو اپنی ذلت پر چپ ہو جاتی ہیں۔ تمھیں اس سب کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اب ہماری ملاقات کورٹ میں ہو گی مسٹر عامر!

جس درخت کے نیچے تہمینہ نے اپنا چھوٹا سا سائبان بنایا تھا۔ اس درخت کو عامر نے جڑوں تک ہلا دیا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ درخت اس کی شخصیت کو تہہ و بالا کر دیتا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا سائبان کہیں اور تلاش کر لے گی۔

عامر کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تہمینہ اُسے کورٹ میں کھینچ لائے گی۔ تہمینہ مقدمہ جیت گئی تھی۔ عامر کو اس کے جہیز کے ساتھ ساتھ مہر کی اسّی ہزار رقم بھی ادا کرنی پڑی تھی۔ وکیل صاحب نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ اگر وہ چاہے تو بد چلنی کی بنا پر عامر سے طلاق بھی لے سکتی ہے۔ ساتھ ہی وہ چاہے تو عامر پر نان نفقے کا دعویٰ بھی کر سکتی ہے۔ جس کے تحت ہر ماہ عامر کو اسے ایک مشت رقم خرچ کے لیے دینی ہو گی، مگر تہمینہ نے ان دونوں ہی باتوں سے انکار کر دیا تھا۔

وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں بچّوں کو پڑھانے لگی تھی۔ عامر سے ملے ہوئے جہیز اور رقم سے اس نے ایک "ادارہ" قائم کیا تھا۔ جس میں سماج کی بے سہارا عورتوں کو کڑھائی، سلائی، کشیدہ کاری اور دوسرے ٹیکنیکل کام بھی سکھائے جاتے تھے۔

بارش تھم گئی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے دودھیا ٹکڑے شرارت کرتے پھر رہے تھے۔ اس نے دیوار گھڑی کی جانب دیکھا۔ چار بجنے ہی والے تھے۔ کچھ ہی دیر میں مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔ آج اس ادارے کا افتتاح تھا۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اُس نے مائک ہاتھ میں لیا——ایک بات میں آپ سب سے کہنا چاہوں گی کہ عورت کمزور نہیں ہے، وہ عزم کا مجسمہ ہے۔ اگر وہ چٹانوں سے بھی ٹکرا جائے تو انھیں بھی ریزہ ریزہ کر دے۔ مذہب نے شوہر کو ایک بہت بڑا درجہ عطا کیا ہے۔ جس کی رو سے ان کی تعظیم ہمیں لاحق ہے۔ مگر جب مرد عورت پر بلا وجہ ظلم کرے۔ اس کا جائز حق اُس سے چھیننے کی کوشش کرے، اسے بلا وجہ طلاق دے دے تو عورت کو بھی اسے یاد دلا دینا چاہیے کہ وہ اتنی بے جان و بے سہارا نہیں ہے اور نہ وہ اتنی کمزور ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے۔ بس اسی جذبہ کے تحت یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ سماج نے جن عورتوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ جن سے اس کے رہنے کی چھت چھین لی گئی ہے۔ ایسی تمام عورتوں کے لیے یہ ادارہ ایک سائبان ہے۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے سارا ہال گونج رہا تھا۔ اور تہمینہ ایک عزم کے ساتھ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی۔ جیسے اُسے آج اپنی منزل مل گئی ہو۔

اور پھر اس رات تہمینہ کو لگا کہ وہ اتنی کمزور نہیں ہے کہ مرد کی جابر فطرت اور فرسودہ روایات کے دائرے میں گھٹتی رہے۔ اس فاتحانہ انداز کے ساتھ اُس نے وہ رات بھی سکون اور استقلال کے ساتھ گزاری۔ اُس میں ایک پھانس سی بھی متواتر کھٹکتی رہی اور اسے محسوس ہوتا رہا کہ جیسے اس کی شخصیت مکمل ہونے کے باوجود بھی نامکمل سی ہے۔

آج بھی جبکہ رات خاموشی سے اپنا سفر طے کرتی ہے۔ رات ڈھلے جب چاند اونگھتا ہے اور ستارے تھکے تھکے سے بجھنے لگتے ہیں تو رات کے اس آخری پہر میں اسے لگتا ہے کہ جیسے پشیمان سا عامر اس کے خیالوں کے دروازے پر مسلسل دستک دے رہا ہے۔ یہ عامر ہے یا اسی طرح کا کوئی اور مرد۔ یہ تو وہ نہیں جانتی لیکن اس جذباتی کیفیت میں بھی وہ اپنے اس فیصلے پر اٹل ہے کہ اب وہ کسی ایسے ہی مرد کے سائبان کو خوش آمدید کہے گی جو اس کی آرزوؤں، اس کی اُمنگوں اور جذبات کا احترام کر سکے۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت اس نے تکیے کو اپنے سینے سے لگایا اور آنکھیں بند کر کے گہرے خیالوں میں ڈوب گئی۔

☐☐

روح کا قرض

شکیب اس دنیا میں نہیں رہا، یہ سنتے ہی میرے دل کو شدید دھکاً لگا۔ میں ایک سیاسی کانفرنس میں گئی تھی وہیں ریشمانے مجھے یہ منحوس خبر سنائی۔ ایک پل تو سنتے ہی لگا کہ جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں ایک عام جلسے میں کھڑی ہوں۔ جہاں لوگ میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہیں۔ حالانکہ اب شکیب سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اب سے بارہ سال پہلے تک وہ میرے خوابوں میں بستا تھا۔ اس کے ساتھ گھر بسانے کے حسین سپنے دیکھے تھے۔ وہ میرا منگیتر تھا۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی آپ کو شکیب سے واقف کرانے کے لیے مجھے چوبیس سال پیچھے لوٹنا ہوگا۔ تو کہانی شروع کرتے ہیں ہمارے اسکول سے۔

چوتھی کلاس میں پڑھنے والی میں ایک معمولی شکل کی بھورے بال والی لڑکی، جس نے ہمیشہ اپنے آپ کو بدصورت سمجھا جو اپنی اور بہنوں کے مقابلے احساسِ کمتری میں بتلا رہی۔ صرف میرا رنگ ہی گورا تھا باقی تو مجھے اپنے آپ میں کبھی کوئی خوبصورتی والی بات نظر نہیں آئی۔ چھوٹی آنکھیں، چپٹی ناک اور سر پر اتنے کم بال کہ دو چٹیا باندھنے کی مجھے حسرت ہی رہی۔ ان کم بخت بالوں کے جتن کے لیے میں نے کیا کیا نہیں کیا۔ جب میں انھیں بڑھانا چاہتی تھی یہ کبھی نہیں بڑھے اور جب میں نے ان کی سنبھال چھوڑ دی تو یہ بڑھ کر کمر کے نیچے تک پہنچ گئے۔ تو بات ہو رہی تھی اسکول کی، ہمارا اسکول انگلش میڈیم تھا جہاں آسمانی اسکرٹ اور سفید شرٹ ڈریس تھی۔ روز صبح تایا ابا گاڑی میں اسکول چھوڑنے جاتے اور ڈیڈی واپسی میں لینے آتے۔ ایک گاڑی میں ہم بارہ بچےّ

ٹھس ٹھسا کر آتے تھے۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر گھر میں قدم رکھا تو ایک بڑی بی امّی سے محوِ گفتگو تھیں۔ جاتے ہی حکم ہوا سلام کا، میں نے سلام کیا اور بیگ پھینک کر کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ بڑی اماں کی نظریں مجھے لگا کہ میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ پھر تو اکثر ان کی آمد و رفت ہمارے گھر پر رہتی۔ ایک دن مجھے میری سہیلی نے ایک فوٹو دکھایا۔ دیکھ اس کا نام شکیب ہے، کیسا ہے یہ!—ایک دم ڈفر کون ہے یہ موٹو؟ موٹو نہیں دیکھ کتنا خوبصورت ہے بڑی بڑی آنکھیں گورا رنگ— تو ہوا کرے بھئی تم مجھے کیوں دِکھا رہی ہو۔ تجھے نہیں پتا اس سے تیری شادی ہو گی۔ اُس وقت میں شادی کے معنی تک نہیں سمجھتی تھی۔ ہاں شادیاں ہوتے ضرور دیکھی تھیں۔ جس میں لڑکیاں نئے سُرخ کپڑے پہنتیں، زیور پہنتیں، خوب سنگھار کرتیں اور آخر میں بھوسڑ بھوسڑ روتی بلکتی اپنی امّی، چچی پھوپیاں اور بہنوں سے گلے مل کر بینڈ باجوں کی دھن پر سسرال رخصت ہو جاتی تھیں اور جب دوسرے دن ہم انھیں دیکھتے تھے تو ان کی شخصیت ہی بدلی ہوئی ہوتی تھی۔ لق دق چمکیلے شرارے، ہاتھوں میں بھر بھر کلائیاں ہری کچی چوڑیاں۔ مانگ اور پلکوں پر افشاں کی تہہ، ناک میں جگ مگ کرتی لونگ اور پیروں میں سُرخ موزے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان دلہنوں کو بھر گرمی میں بھی موزے پہننے پڑتے تھے۔ یہ کوئی تک ہوا شادی ہوئی ہے تو سرخ موزے پہننے بھی ضروری۔ چاہے پسینوں میں پیر گیلے ہوتے رہیں۔ مجال کیا کہ یہ موزے اتار دیں۔ ایک بات اور ان دلہنوں کی جو مجھے بُری لگتی تھی وہ یہ کہ جب جب انھیں دیکھنے کے اشتیاق میں کمرے میں جھانکتے یہ کمینیاں ہمیشہ سوتی ملتیں۔ اس بات پر تو مجھے ہمیشہ غصہ آتا تھا کہ دولہا بھائی نے انھیں کیا افیم کا انٹا کھلا دیا ہے۔ میکے میں آئیں اور خراٹے بھرنا شروع، تو شادی میرے لیے سرخ جوڑے اور زیوروں تک محدود تھی۔ بس ایک رسم وہی گلے مل کر سُبک سُبک رونے والی مجھے پسند نہیں تھی۔ میں تو کہتی بھی تھی۔ دیکھنا ہم دلہن بنیں گے تو روئیں گے ہی نہیں۔ روئے ہماری جوتی کتنا مزا آئے گا۔ ممّی کی ڈانٹ سے دور ہم تو سسرال میں رہیں گے۔ ممّی کے گھر آئے گا میرا ٹھینگا۔ روز صبح اسکول بھیجتی ہیں پھر دوپہر میں کھیلنے نہیں دیتیں، قرآن شریف پڑھنے بھیج دیتی ہیں۔ ہم تو جیسے گِدھ ہو گئے بستا لادے لادے

پھر و۔ پھر شمیم نے مجھے اس کے اور فوٹو بھی لا کر دکھائے۔ تب تک گھر والوں نے میری منگنی شکیب سے طے کر دی تھی۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ شادی جب میں بڑی ہو جاؤں گی تب ہو گی۔ منگنی والے دن شکیب کی امّی میرے لیے ایک سیٹ چوڑیاں اور نیا سوٹ لائیں تھیں۔ تو اس طرح میری منگنی شکیب کے ساتھ ہو گئی۔

کچھ سال بعد وہ اسکول چھوڑ کر میں دوسرے اسکول جانے لگی۔ اسی اسکول سے گیارھویں پاس کرنے کے بعد میں نے کالج میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ تب تک میں منگنی اور شادی کے معنی سمجھنے لگی تھی۔ اب تک مجھے علم ہو گیا تھا کہ شکیب نے یہ منگنی اپنی پسند سے کی ہے۔ جس وقت میں چوتھی میں تھی وہ گیارھویں کا امتحان دے رہا تھا۔ ان دنوں میں اپنی پڑھائی میں مصروف تھی اور پسند ناپسند جیسے الفاظ میرے دماغ میں نہیں تھے۔ پتا تھا بی اے کرنے کے بعد میری شادی اس سے ہو جائے گی۔ چونکہ اب ہم لوگ اپنے اس رَشتے کو سمجھنے لگے تھے۔ اس لیے وہ کبھی کبھی مجھ سے فون پر بھی بات کرتا تھا۔ ملنے کے لیے ہر کبھی کالج بھی آدھمکتا تھا۔ حالانکہ میں اس طرح ملنے جلنے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ میں جب بھی اسے اس بات کے لیے منع کرتی وہ دھمکی دیتا کہ منگنی توڑ دوں گا۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک بار اگر منگنی ٹوٹی تو پھر مجھ سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔ میں اس قدر بزدل تھی کہ اپنے اور اس کے گھر والوں کی تمام باتیں بغیر کسی حیل وحجّت کے مان لیتی تھی۔

میں یوں ہمیشہ شلوار سوٹ ہی پہنا کرتی تھی۔ پہلے شکیب نے اپنی امّی سے کہلوایا کہ میں جب گھر سے باہر نکلوں تو سر پر دوپٹہ اوڑھ کر نکلوں۔ اُس دن کے بعد جب جب جب میرے سر سے دوپٹہ گرا، مجھے اپنے اور ہونے والے سسرال والوں کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا کے چند دنوں بعد ہی شکیب کی امّی نے دوسرا نادر شاہی حکم صادر کر دیا کہ میں کسی بھی خاندانی تقریب میں یا کالج جاؤں تو برقعہ پہن کر جاؤں۔ مجھے سخت ناگوار گزرا اور میں نے طے کر لیا کہ امتحان کا رزلٹ آنے کے بعد میں پڑھائی چھوڑ دوں گی۔ کچھ دنوں بعد میرا رزلٹ آگیا اور جیسی کہ اُمّید تھی میں فسٹ ڈویزن رہی۔ اب میں نے گھر والوں پر دباؤ ڈالا کہ اگر میں کالج گئی تو برقعہ نہیں

اوڑھوں گی۔ پتہ نہیں ممی نے کس طرح اُن لوگوں کو سمجھایا۔ مجھے کالج جاتے وقت برقعہ نہیں اوڑھنے کی چھوٹ مل گئی۔ ایک دن شکیب کالج آپہنچا اور ضد کی کہ میرے ساتھ کافی پینے چلو۔ ریسٹورینٹ میں میں کافی پیتی رہی وہ سگریٹ کے چھلّے میرے منہ پر اُڑاتا رہا۔ جب میں نے اسے اس حرکت سے منع کیا تو وہ طیش میں آگیا اور ایک سگریٹ مجھے دے کر کہنے لگا کہ میں خود اسے جلا کر دوں۔ میں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور اس طرح ہمارے ملنے جلنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یوں بھی ہمارے ملنے کی خبر اُس نے اپنے گھر والوں کو بتادی تھی۔ اس کے گھر سے یہ خبر میرے گھر تک پہنچ گئی۔ جس کی وجہ سے مجھے سخت شرمندگی اُٹھانی پڑی۔

اس واقعے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شکیب سے اپنے رشتے کو بنائے رکھنا میری محبت نہیں مجبوری ہے۔ میں پھر سب کچھ بھول کر پڑھائی میں محو ہو گئی۔ لکھنے پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا۔ میں پوری طرح کتابوں میں ڈوبی رہتی۔ ایک دن پھر شکیب کا فون آیا۔ اس نے کہا کہ میں جلد ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے جواب دے دیا کہ یہ پہلے ہی طے تھا کہ ہماری شادی میرے بی اے کرنے کے بعد ہوگی۔ لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہا کہ دو مہینے کے اندر اندر شادی تو کرنی ہی ہے۔ میرے دوست تمھارے بارے میں باتیں بناتے ہیں کہ تم لوگ بڑے موڈرن ہو اور شادی کے بعد تم مجھے غلام بنا کر رکھو گی۔ میں نہیں چاہتا تم میرے برابر کہلاؤ۔ کیونکہ شکیب ایم اے اول میں فیل ہو گیا تھا۔ میں بی اے سال دوئم میں تھی اور ایک سال بعد بی اے کی ڈگری مجھے مل ہی جانی تھی ایسی صورت میں اس جلد بازی والی شادی کے لیے میں قطعی تیار نہیں تھی۔ یہ زندگی میں میری پہلی بغاوت تھی۔ اس کے بعد نہ ہم کہیں ملے اور نہ فون پر بات کی۔ میں نے اپنے اس فیصلے سے گھر والوں کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس درمیان شکیب کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ چل بسے۔ غم اور مصیبت میں ہمارا خاندان ہر رسم میں شریک ہوا۔

اب اپنے والد کے مرنے کے بعد شکیب ان کا واحد وارث تھا۔ مفت ہاتھ آئی دولت کو وہ اپنے شوق پر خرچ کرنے لگا۔ گھر میں پہلے بھی اس کا رعب چلتا تھا۔ اب تو

حال ہی دوسرے تھے وہ اپنی سات بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس لحاظ سے بہنیں اُس سے ڈرتی بھی تھیں اور پیار بھی کرتی تھیں۔ سب سے پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ اپنی بہنوں کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔ اللہ بخشے جب اُس کے والد زندہ تھے تب بھی ان کے دروازے اوروں کے لیے ہمیشہ بند رہتے تھے اب تو کھڑکیاں تک بند رہنے لگیں۔ میری سہیلیاں بتاتی تھیں تیرے سسرال میں ٹی وی دیکھنا، بازار جانا، فلم دیکھنا سب منع ہے۔ وہاں مرگھٹ جیسا سناٹا چھایا رہتا ہے۔ شکیب کی بہنوں کو جھری سے جھانکنا تک منع ہے۔ میرا دل سن سن کر دھک دھک کرتا رہتا کہ میں اس گھر میں اپنی زندگی کیسے گزاروں گی۔ اس درمیان مجھے آل انڈیا ریڈیو پر پروگرام ملنے لگے تھے۔ میں بی اے فائنل ایئر کا امتحان دے کر رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ چھٹیوں میں ہم سب گھومنے ماؤنٹ آبو چلے گئے۔ واپسی میں جب جے پور آئی تو پتہ لگا کہ شکیب مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور ان دنوں شراب پینے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں ہاتھوں سے باپ کی دولت لٹا رہا ہے۔

اب فیصلے کی گھڑی آ ہی گئی تھی۔ اپنے دس سال پرانے اس رشتے کو میں آگے بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ سب سے پہلے میں نے برقعہ اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ یہ مجھ پر لادا گیا تھا۔ میں شروع سے ہی دکھاوے میں یقین نہیں رکھتی۔ آپ اگر پاکیزہ ہیں تو برقعہ کے بغیر بھی آپ ویسی ہی رہیں گی اور اگر آپ نے بدکرداری اور بد عنوانی کا فیصلہ کر لیا ہے تو برقعہ بھی آپ کو بچا نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے چند لوگ میری اس بات سے متفق نہ ہوں۔ تو بھی سچ کہنے کے میرے اس حق سے تو لوگ متفق ہوں گے۔ میرے اس فیصلے سے گھر میں تھوڑا بہت ردِ عمل ہوا۔ جسے میں نے خاموشی سے سہہ لیا۔

میرا رزلٹ آیا اور میں بی اے میں شاندار نمبروں سے پاس ہوئی۔ میں نے یونیورسٹی جانے کی تیاری کرتی اور ایم اے میں داخلے کا فارم بھر دیا۔

شکیب تو ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ میں اُس سے زیادہ پڑھوں۔ چنانچہ اب مجھے ایک اور سخت فیصلہ کرنا تھا۔ میں نے امّی سے صاف کہہ دیا کہ آپ منگنی توڑ دیجیے۔ مجھے نہیں لگتا میں اُس شخص کے ساتھ نباہ پاؤں گی۔ امّی اس انتظار میں تھیں کہ ادھر سے بات توڑی

جائے۔ ہم لڑکی والے ہیں تاکہ ہمیں آگے کہنے کے لیے جگہ رہے کہ ہم تو نبھانا چاہتے تھے۔ میں اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ جب نکاح جیسی بڑی چیز کے لیے خدا نے یہ اجازت دی ہے کہ پہلے لڑکی سے پوچھا جائے تو پھر منگنی کے لیے آخر ادھر سے ہی کیوں پہل کی جائے۔ مجھے اگر کسی سے شادی نہیں کرنی ہے تو یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ اس میں سماج کہاں سے آگیا۔ چنانچہ ہم نے پہل کی، ان کی انگوٹھی اور جو بھی سامان تھا بھجوا دیا۔ وہاں سے بھی انگوٹھی واپس آگئی۔ اس طرح دس سال تک یہ منگنی رہنے کے بعد ٹوٹ گئی۔ رشتہ تو میں سمجھتی ہوں ہمارا بہت پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے افسوس تھا بھی اور نہیں بھی۔ میں اس سے محبّت بھی کرتی تھی اور نفرت بھی۔ میں نے اس کے ساتھ گھر بسانے کے سپنے تو دیکھے تھے لیکن جب مجھے لگا کہ میں اس کے ساتھ زندگی کا طویل سفر طے نہیں کر سکتی تو اپنے ہی ہاتھوں سے میں نے یہ سپنے توڑ بھی دیے تھے۔

ہمارا یہ رشتہ ٹوٹنے کے چند مہینوں بعد ہی شکیب نے اپنے ہی عزیزوں میں شادی کرلی۔ لڑکی اس نے خود منتخب کی تھی۔ وہ آٹھویں پاس تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ لڑکی کم پڑھی لکھی ہو تبھی وہ اپنے شوہر کا کہنا مانتی ہے۔ اس کا گھر میرے پڑوس میں ہی تھا۔ ہر بڑی چھوٹی بات کی خبر مجھے مل جاتی یا یوں کہہ لیجیے کہ مجھ تک پہنچائی جاتی تھی۔ نئی دلہن اس کا بہت کہنا مانتی ہے۔ وہ کہتا ہے تو اٹھتی ہے وہ کہتا ہے تو بیٹھتی ہے۔ مجھے اس کی دلہن کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ لیکن میں کسی بھی خاندانی تقریب میں نہیں جاتی تھی اس لیے شادی کے ایک سال بعد تک ہمارا کبھی ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا۔ ہاں شکیب اکثر مجھے یونیورسٹی جاتے یا آتے وقت مل جایا کرتا تھا مگر ہم اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے سے گزر جاتے۔ بلکہ میں اس کے گھر کے سامنے سے اپنی گاڑی اس قدر تیزی سے گزارا کرتی تھی جیسے پیچھے کوئی بھوت پڑا ہو۔

میں نے ایم اے کر لیا تھا اور اب مزید پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہی تھی۔ اس درمیان میرے ٹی وی پروگرام بھی آنے لگے۔ اخباروں رسائل میں شائع ہونے لگی۔ اپنی منگنی ٹوٹنے پر میں نے ایک نظم لکھی تھی "سرابِ محبّت" جو بے انتہا مقبول ہوئی۔ اس طرح میرا شاعری میں بھی رجحان بڑھنے لگا۔ سیمینار، غزل مقابلہ، بیت بازی غرض یونیورسٹی کے

ہر پروگرام میں میں ضرور شریک ہوتی۔ ایک مرتبہ ایک ٹی وی پروگرام میں محترمہ عصمت چغتائی سے ملی۔ انھوں نے آٹوگراف دیتے ہوئے میری ڈائری میں لکھا "زینت ادب کی زینت بنو تم" بس میرے دل پر ان کے یہ الفاظ نقش ہو گئے۔ اب چونکہ آپ سمجھ گئے ہیں کہ میں یہ کہانی اپنے متعلق لکھ رہی ہوں۔ میں اب جھوٹ بولوں گی بھی نہیں۔ لیکن آپ اسے افسانہ سمجھ کر ہی پڑھیے۔ تو اس کے بعد یہ شاید عصمت آپا کے الفاظ کا ہی کمال تھا۔ میرا تخلیقی سفر آگے بڑھتا رہا۔ اتفاقاً مجھے پیشہ بھی ایسا ملا جس سے خود بخود شہرت ملتی رہی۔

اب پھر شکیب کی خیر خبر لیتے ہیں۔ اس درمیان پتہ لگا کہ اس کے تین بچے ہو گئے ہیں۔ مگر فطرت میں شکّی پن اور شراب نوشی کی عادت بدستور قائم ہے۔ یوں اس کی گھر گرہستی مزے سے چل رہی تھی۔ پی ایچ ڈی کے بعد میں نے سروس کر لی اور میرے رات دن مصروف ہوتے گئے۔ مشاعرے، غزلیں، کہانیاں اور خبریں میری دنیا انھیں کے ارد گرد گھومنے لگی۔ اور شکیب میری زندگی کا ایک بھولا فسانہ ہو گیا۔ حالانکہ اب بھی ہر روز میری گاڑی اسی کے گھر کے سامنے سے گزرتی تھی۔ لیکن میں نے اُس گھر کے بند کھڑکی دروازوں کے پیچھے زندگی کا کیا حال ہے؟ یہ کبھی جاننے کی کوشش کی ہی نہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ میرا اس گھر سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں پھر میں کیوں یہ جاننے کی کوشش کروں کہ وہ کس حال میں ہے؟ وہ شخص اب بھی اکثر دکھائی دیتا تھا۔ میری لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ میں نے اس کے متعلق کبھی غور ہی نہیں کیا۔ پرسوں جب ریشما نے مجھے یہ خبر سنائی تو میں ایک سیاسی اجلاس میں گئی تھی۔ اس اجلاس کی رپورٹ مجھے اخبار میں دینی تھی۔ ریشما نے مجھے علیحدہ کونے میں بلایا اور کہا کہ تیرے لیے ایک دکھ خبری اور ایک خوش خبری ہے۔ پہلے کیا سنے گی۔ میں نے کہا کہ کچھ بھی سنا دے اپنی تو دنیا ہی خبر ہے۔ تب اس نے کہا کہ شکیب کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ مجھے سن کر واقعی بُرا لگا۔ بھلا کسی جوان کو موت آنا میرے لیے خوش خبری کیوں ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے کہا بھی، تمھیں اس طرح نہیں کہنا چاہیے۔ تم نے اُس سے منگنی توڑی تھی نا، میں نے اس لیے ایسا کہا۔ ویسے میں جانتی ہوں تجھے دکھ ہوا ہے۔ تجھ میں

بہت انسانیت ہے۔

میں نے خدا سے فوراً اس کی مغفرت کے لیے دُعا مانگی۔ ہم راستے بھر اسی کی باتیں کرتے رہے۔ ریشما نے بتایا کہ وہ ایک مہینے سے بیمار تھا۔ لیکن میں نے تو دو تین روز پہلے ہی دیکھا تھا۔ پاگل وہ پندرہ دن سے تو ہاسپٹل میں ہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اسے ہر روز راستے میں آتے جاتے دیکھتی تھی نا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا تو بھی میرے ذہن میں یہی رہتا تھا کہ وہ یہیں کہیں کھڑا ہوگا۔ اس کی میری زندگی میں اہمیت نہیں تھی نا اس لیے اس کا میرے سامنے نہ ہونا بھی مجھے محسوس نہیں ہوا۔ ریشما مجھے یادوں کے جنگلوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر خود تعزیت کے لیے شکیب کے گھر روانہ ہوگئی۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ میں وہاں جاکر کچھ سیپارے پڑھ کر اس کی روح کو بخش دوں۔ ہمسایا ہونے کے ناطے یہ میرا فرض بنتا تھا۔ لیکن لوگ مجھے وہاں دیکھ کر کیا سوچیں گے؟ کہیں اس کی بیوی اور ماں یہ نہ سمجھیں کہ میں ان کی بے بسی کا مذاق اُڑانے آئی ہوں۔ دوسرے مجھے آگے اور ایک پریس کانفرنس اٹینڈ کرنی تھی۔ اس لیے اپنے دماغ پر اس کی موت کا بوجھ لیے میں ہوٹل براڈوے پہنچی جہاں ٹرک آپریٹرس کی پریس کانفرنس تھی۔ وہاں سے فارغ ہو کر جب میں لوٹ رہی تھی تو راستے میں جنازہ مل گیا۔ اس جنازے میں جانی پہچانی شکلیں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یقیناً یہ شکیب کا ہی جنازہ ہے۔ میں نے بہت ساری سورتیں پڑھ کر اسے بخشیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آخری سفر پر جاتے ہوئے مجھے خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ میرے ہمراہ ایک اور اخبار کا رپورٹر بھی تھا۔ جسے بازار سے چند ضروری سامان چاہیے تھا۔ چنانچہ ضد کر کے وہ مجھے اپنے ساتھ بازار لے گیا۔ خرید و فروخت میں دو گھنٹے گزر گئے۔ مغرب کی اذان ہونے والی تھی اس لیے میں نے گھر کی راہ لی۔ میں جب گھر لوٹ رہی تھی تو پھر راہ میں مجھے وہی جانی پہچانی شکلیں ملیں۔ وہ شکیب کو دفنا کر قبرستان سے واپس آرہے تھے۔ میں کوئی بھی کام کرتی ذہن سے یہ بات نکلتی ہی نہیں کہ وہ مر چکا ہے۔ کم از کم اس کی بیماری میں تو مجھے اس کا حال پوچھنے جانا ہی چاہیے تھا۔ لیکن میں بھی کیا کرتی مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ ہر روز اب بھی میں اس کے گھر کے سامنے سے ہو کر دفتر کے لیے گزرتی ہوں۔ پہلے مجھے ایسا

کبھی محسوس نہیں ہوا لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ اس کی دو بڑی بڑی کشادہ آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے کہ ساری دنیا کی خبر رکھنے والی نے آخر میری خبر کیوں نہیں لی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں بند دروازوں کے پیچھے تنہا رہ گئی ساس بہو سے جا کر پوچھوں کہ وہ کس حال میں ہیں؟ ہمدردی کے چند بول کہوں میں جس سے انھیں تسلی تشفی ملے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکی۔ ہر روز صبح اٹھ کر سوچتی اور شام تک پھر ارادہ ملتوی ہو جاتا۔ آخر پندرہ دن گزر گئے۔ میری پریشانی کا یہ عالم تھا کہ دفتر میں، کاغذوں پر، دیواروں پر، بازاروں میں مجھے ہر جگہ اس شخص کا چہرہ نظر آتا۔ میں اکثر سوچتی انسانیت کے ناطے ہی سہی مجھے اس کے گھر جانا چاہیے۔ پتہ نہیں کیوں اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر اور وہاں کے باشندوں سے مجھے ایک جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

آخر امّی کو ساتھ لے کر میں اس کے گھر جا پہنچی۔ دروازہ کھلا میں نے پہلا قدم رکھا اپنے سابق سسرال میں۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کبھی اس طرح کے حالات کے درمیان داخل ہوں گی۔ ایک مدھم سی روشنی والے کمرے میں اس کی ماں اور بیوی بیٹھی تھیں۔ میں سلام کرنا چاہتی تھی مگر زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا بات کروں؟ لگتا تھا گھڑی کی سوئیاں تھم گئی ہیں۔ اس کی بیوی اور میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوچا کتنی بدنصیب ہے یہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ شاید اس نے کہا ہو میری جگہ تمھیں ہونا تھا۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ میں تمھارے اور بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مگر اب پھر وہی مشکل تھی کہ الفاظ زبان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ ایک گھنٹے وہاں ہم رُکے اس درمیان میں نے بچوّں سے باتیں کیں۔ کس اسکول اور کس کلاس میں پڑھتے ہیں یہ معلوم کیا۔ اس کے علاوہ اس کے ایک مکان پر کسی کرائے دار نے قبضہ کر رکھا ہے۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ پولیس کی مدد سے میں ان کا یہ کام کروا دوں گی۔ دس بج رہے تھے، چنانچہ ہم نے اجازت چاہی۔ اُس کی سب بہنیں، ماں اور بیوی ہمیں چھوڑنے دروازے تک آئیں۔ اس کی بیوی نے مجھے وہ ڈائری بھی دکھائی جس میں وہ میرے متعلق ہر روز چند باتیں لکھتا تھا۔ ڈاس کی ممّی بار بار نظر اُٹھا کر مجھے دیکھتی تھیں جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہوں۔ میں

نے انھیں سلام کرتے ہوئے کہا کہ آنٹی پلیز کوئی کام ہو تو ضرور بتائے گا۔ وہ کہنے لگیں کہ تم سے ملنے کی آرزو لیے میرا بچہ تڑپتا ہوا اس دنیا سے چلا گیا۔ وہ تم سے ملنا چاہتا تھا، مرنے کے دو روز پہلے بھی کہا تھا کہ میری اس سے بات کروادو، وہ میری بچپن کی دوست ہے۔ مگر میں نے منع کر دیا کہ عزّت دار لوگ ہیں تمھاری اس بات سے انھیں تکلیف ہوگی۔ وہ ہر روز ہاسپٹل میں تمھارا انتظار کرتا تھا کہ تم اس سے ملنے آؤگی۔ میں انھیں کیسے سمجھاتی کہ مجھے اس کی بیماری کا علم نہیں تھا ورنہ میں اس کی مزاج پرسی کو ضرور جاتی۔ آنٹی نے روتے ہوئے کہا کہ آج تمھیں اس گھر میں دیکھ کر میرے بیٹے کی روح کس قدر خوش ہو رہی ہوگی۔ میں سوچتی ہوں نہ جانے وہ کون سی غیبی طاقت تھی جو مجھے اس قبرستان والے راستے پر کھینچ کر لے گئی جہاں سے وہ اپنے آخری سفر پر جا رہا تھا۔ رات زیادہ ہوگئی تھی اس لیے میں نے پھر ایک مرتبہ ان سے اجازت چاہی۔ آنٹی نے میرے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں بھولنا مت، اس گھر کو اپنا سمجھ کر آتی رہنا۔ ہم دونوں اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئے ہیں۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھ سے یہ کہلوادیا کہ میں پھر آؤں گی۔ جب میری منگنی ٹوٹی تھی تو اس خاندان سے ہمارے ہر رشتے ختم ہوگئے تھے۔ ہماری وجہ سے خاندان کے دوسرے عزیزوں نے بھی ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے نا، اس شخص کے جیتے جی اس گھر کے دروازے مجھ پر کبھی نہیں کھلے اب جبکہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکا ہے تو یہ دروازے خود بخود کھل گئے ہیں۔ جب وہ زندہ تھا اور میری شادی کا اس سے ذکر چلا تھا تب میں اس کو اپنا گھر نہیں سمجھ سکی تھی۔ اب جبکہ وہ اس گھر سے ہی کیا اس دنیا سے بھی ہمیشہ کے لیے کبھی نہ لوٹنے کے لیے جا چکا ہے تو یہ گھر میرا اپنا ہو گیا ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے میں اس کے ننھے بچّوں اور بیوی کو اس دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے ہرگز تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے اس کی بیوی کو سمجھایا ہے، وہ دوبارہ اپنی تعلیم شروع کردے۔ میں اسے ساری تیاّری کروادوں گی۔ آج اس کے گھر جا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ شاید کسی حد تک میں نے اس کی روح کا قرض چکا دیا ہے۔

□□

ادھورے سوال

چاروں طرف زبردست گہما گہمی تھی، رنگ برنگے برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شہنائیوں کی گونج بتا رہی تھی کہ آج یہاں شہر کے جانے مانے بزنس مین جاوید صاحب کی لڑکی روبی کی شادی ہے۔

روبی چودھویں کا چاند بنی اپنی سہیلیوں کے حلقہ میں بیٹھی ہوئی تھی...... ہر طرف شور و غل، قہقہے اور خوشیوں کے فوارے برس رہے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز میں — "کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل موہے۔" بج رہا تھا۔

واقعی روبی کی شادی پردیس میں ہو رہی تھی بارات چنڈی گڑھ سے آ رہی تھی، لڑکا چنڈی گڑھ کے گورنمنٹ ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔

اتنے میں شور اُٹھا کہ بارات آگئی......

بارات کا بہت شاندار استقبال ہوا۔ نکاح کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد کھانے کا دور چلا جب رخصتی کا وقت قریب آیا تو ساری فضا ایک دم غمگین سی ہو گئی کس قدر کرب آمیز لمحات ہوتے ہیں۔ کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے عزیزوں، اپنے رشتے داروں کو چھوڑ کر اچانک ہی نئی دنیا نئے لوگوں کی طرف قدم بڑھانا۔ ہر شخص کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

جیسے تیسے رخصتی کی رسم پوری ہوئی اور سینکڑوں اشکبار آنکھوں کے درمیان بارات چنڈی گڑھ کے لیے روانہ ہو گئی۔

ٹرین مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی مگر دولہا والوں نے تین ڈبّے پہلے سے ریزرو کرا لیے تھے اس لیے ان لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ گاڑی رات کی تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی فرّاٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ دولہا کے دوست اور اکثر براتی سو چکے تھے۔ جاگ رہی تھی تو صرف روبی، جس کے ذہن میں اپنے مستقبل کے لیے ڈھیر سارے حسین خواب پوشیدہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے معصوم سے دل کے ایک گوشے میں ایک خوف بھی سمایا ہوا تھا کہ نہ جانے اس کی سسرال کے اجنبی لوگ کیسے ہوں گے...... یہی سوچتے سوچتے نہ جانے روبی کی کب آنکھ لگ گئی۔

ٹرین تیزی سے دوڑ رہی تھی کہ اچانک ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ رُک گئی تمام مسافروں کی آنکھ اس زوردار جھٹکے کی وجہ سے کھل گئی اور تقریباً سارے ہی مسافر اپنی اپنی جگہ پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ سنسان جنگل میں رات کے ایک بجے اچانک ٹرین کیوں رُک گئی......؟

اتنے میں جنگل کی خاموش فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی...... چاروں طرف سے چیخ پکار کی صدائیں بلند ہونے لگیں کچھ دہشت گرد ٹرین میں گھس آئے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا وہ اس کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کتنی جانیں دہشت گردوں کی گولیوں سے ضائع ہو گئیں۔

اسی اثنا میں دہشت گردوں کی نظر روبی پر پڑی جو سُرخ جوڑے میں گٹھری بنی شدّتِ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک تو روبی بے حد خوبصورت تھی دوسرے سُرخ جوڑے اور زیورات میں تو اُس کا حسن قابلِ رشک ہو گیا تھا۔ دہشت گرد آگے بڑھے ان کی وحشیانہ صورتیں دیکھ کر خوف اور دہشت سے روبی کی چیخ نکل گئی لیکن بے چاری کو بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کا بزدل شوہر اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر نہ جانے کہاں بھاگ گیا تھا......

مسافروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر اُن کا سامان اپنے قبضہ میں کرنے کے بعد

دہشت گردوں نے روبی کو پکڑا اور ٹرین سے اُترنے کے بعد اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

دہشت گردوں کی وین قریب ایک گھنٹہ تک انجانے راستوں پر دوڑنے کے بعد ایک مکان کے سامنے جا کر رُک گئی۔ وہ روبی کو زبردستی گھسیٹتے ہوئے مکان کے اندر لے گئے انھوں نے اُسے ایک کمرے میں دھکیل دیا اور خود شراب کی بوتلیں نکال کر اپنی کامیابی کا جشن منانے لگے۔ روبی کو ایک مجبور لڑکی سمجھ کر انھوں نے رسّیوں سے نہیں باندھا تھا۔ دہشت اور خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں کچھ ہی دیر کے بعد اس کی عزّت کے ورق بکھرنے والے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے......؟

تبھی اس کی نظر سامنے رکھی رائفلوں پر پڑی۔ سارے دہشت گرد نشہ میں چور تھے اور اپنی کامیابی کے چرچے کر رہے تھے روبی کے ذہن نے فوراً ایک اہم فیصلہ کر لیا وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور ان کی نظروں سے بچتی ہوئی اسلحے کے اُس ڈھیر تک جا پہنچی اس نے جلدی سے ایک مشین گن اُٹھائی اور اُس کا رُخ ان دہشت گردوں کی طرف کر کے ایک لمحہ کے اندر اسٹر یگر دبا دیا۔ مشین گن شعلے اُگلنے لگی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ پاتے گولیاں ان کے سینوں کے پار ہو چکی تھیں۔ روبی نے کمال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلک جھپکتے ان تمام دہشت گردوں کا خاتمہ کر دیا.....

اب اس کے سامنے اپنے مستقبل کے لیے کوئی پلان نہیں تھا۔ اس اندھیری رات میں اجنبی جگہ سے وہ جائے بھی تو کہاں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کا بقیہ حصّہ بھی اسی مکان میں گزارے گی۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بجے تھے صبح ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ جیسے تیسے روبی نے ان دہشت گردوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشوں کے درمیان رات کا باقی وقت گزارا۔ صبح ہوتے ہی اس نے وہ مکان چھوڑ دیا۔ اپنے تمام زیورات اُتار کر اپنے پرس میں ڈال لیے سڑک پر پہنچنے کے بعد اس نے رکشہ کرایہ پر لیا اور اس سے قریبی پولیس اسٹیشن چلنے کو کہا.....

صبح کا وقت تھا ڈیوٹی پر تعینات کانسٹیبل اپنی جگہ بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ روبی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دوسرے روم میں ایک دوسرا کانسٹیبل فائلیں درست کر رہا تھا۔ روبی نے اپنی پوری داستان اُسے سنا ڈالی...... کانسٹیبل نے فوراً ہی چاروں طرف فون کھڑکھڑا دیے۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے آئی۔جی،ڈی، آئی جی کمشنر سب تھانے میں جمع ہو گئے۔ روبی نے سب کے سامنے پھر وہی داستان دہرا دی۔

دوسرے دن عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی بہت سے چشم دید گواہوں کے بیانات سننے کے بعد جج صاحب نے مقدمہ کا فیصلہ ایک ہفتہ بعد سنانے کا اعلان کیا...... اس درمیان عدالت نے روبی کو اجازت دی کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے مل سکتی ہے۔

جیل کے واڑن نے جب اس سے کہا کہ تمھارے والدین اور رشتہ دار تم سے ملنے آئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اپنے ڈیڈی اور ممی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں اُسے پورا یقین تھا کہ اُس کے والدین اُسے گلے سے لگا کر "بہادر بیٹی" کا خطاب دیں گے۔

لیکن...... یہ کیا...... جاوید صاحب کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے...... انھوں نے خونخوار نظروں سے روبی کو دیکھتے ہوئے کہا "کمبخت لڑکی تو نے ہمیں سماج میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا...... اس سے تو اچّھا تھا تو کسی ندی یا کنویں میں ڈوب مرتی۔ اب ہم سماج کو کیا جواب دیں گے......؟"

"تو نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا تیری چھوٹی بہنوں کی شادی اب کیسے ہو گی......؟ اچھا ہوتا جو تو اُن لوگوں کے ہاتھوں ماری جاتی ہم اس ذلّت سے تو بچ جاتے۔"

روبی کو قطعی اُمّید نہیں تھی کہ اس کے والدین اُسے ان الفاظ سے نوازیں گے...... اس نے پر اُمّید نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس نے شرعی طور پر اُسے اپنی بیوی قبول کیا تھا...... عمر چپ چاپ ایک کونے میں کھڑا تھا بپھر کر بولا "روبی......! مجھے

تم سے صرف دو باتیں کرنی ہیں وہ دو باتیں یہ ہیں کہ آج اور اسی وقت سے میرا اور تمھارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں تمھیں طلاق دیتا ہوں اپنی نظروں میں چاہے تم گنگا جل کی طرح پاکیزہ ہی کیوں نہ ہو لیکن میری اور سماج کی نظروں میں تم خونی ہو۔ یہی نہیں تم نے ایک رات ان دہشت گردوں کے ساتھ گزاری ہے میں کس کس کو تمھاری پاک دامنی کا ثبوت دیتا پھروں گا...... ؟ آج سے میرے اور تمھارے راستے الگ الگ ہیں......"

روبی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اُس پر یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے اُسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی بہادری کی اُسے اتنی بڑی سزا ملے گی ...... ؟

آج کمرۂ عدالت میں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی روبی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی تھی اس کے چہرے پر خوف یا دہشت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آج جج صاحب کو اس اہم ترین مقدمے کا فیصلہ سنانا تھا۔ اچانک شور اُٹھا کر جج صاحب آگئے ہیں۔ سب لوگ اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ جج صاحب بہت ہی پر وقار انداز میں چلتے ہوئے اپنی جگہ تک پہنچے اور اپنی کرسی پر رونق افروز ہوگئے۔ چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی اور روبی سے مخالب ہوئے۔

"کیا ملزمہ روبیہ خانم بنت جاوید کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے...... ؟" کیونکہ روبی نے وکیلِ صفائی لینے سے انکار کر دیا تھا جج صاحب نے جب دوبارہ اس سے پوچھا کہ "تمھیں اپنی صفائی کا عدالت ہٰذا پورا موقعہ فراہم کرتی ہے اگر تمھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو بلا خوف و خطر کہو......" اس بار روبی اپنے آپ کو روک نہ سکی...... وہ اپنے ایک مخصوص لب و لہجہ میں بولی......"یور آنر...... مجھے اپنی صفائی میں تو کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ البتہ مجھے جواب چاہیے اس سماج سے جس سے ڈر کر میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی......"

"مجھے جواب چاہیے اپنے والدین سے، جن کی نظروں میں اُن کے خاندان کے لیے داغ بن گئی ہوں میں......"

"میں بھی اگر دوسری لڑکیوں کی طرح عصمت ریزی کا شکار ہو جاتی...... دوسری لڑکیوں کی طرح جو غنڈوں کے ذریعہ اُٹھالی جاتی ہیں اور بعد میں یہ مجبور اور بے بس لڑکیاں اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتی ہیں اگر میں بھی انھی لڑکیوں کی طرح سماج سے ڈر کر خود کشی کر لیتی تو میں ان لوگوں کی نظروں میں عظیم ہو جاتی۔ چار آنسو میری لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر بہا لینے کے بعد یہ سمجھتے کہ انھوں نے بہت عظیم کام انجام دیا ہے۔ کچھ سماج سیوی ادارے اور عورتوں کی چند تنظیموں کی طرف سے جلوس نکلتے کہ میرے قاتلوں کو گرفتار کیا جائے۔ اخبارات اور رسائل میں دل کھول کر میری مظلومیت کے چرچے ہوتے...... میری شرافت اور پاکبازی کے قصیدے لکھے جاتے۔"

"اگر میں خودکشی نہیں کرتی ان دہشت گرد غنڈوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی اور پھر وہ مجھے کسی سڑے نالے میں پھینک دیتے پھر ان سے انتقام لینے کے لیے میں بندوق اُٹھالیتی اور بن جاتی "پھولن دیوی" تب شاید اس سماج اور اس قانون کی نظروں میں میری حیثیت ہی کچھ اور ہوتی...... تب شاید ان کی نظروں میں میرے لیے حقارت کی بجائے خوف ہوتا...... دہشت ہوتی...... میرا شوہر......! جس نے بڑے فخر سے مجھے طلاق دے دی ہے، کل وہی بزدلوں کی طرح قانون سے اپنی حفاظت کی مانگ کرتا۔"

"میرے ماں باپ، جن کی نظروں میں آج میں بہت حقیر لڑکی ہوں کیونکہ بقول ان کے میں نے اپنی عزّت اور عفّت کے ڈاکوؤں کو مار کر بڑا حقیر کام کیا ہے۔ کل وہی میرے ماں باپ مجھے دیکھ کر شدّتِ خوف سے تھر تھر کانپتے...... اور یہ سماج جس کی آپ سب دُہائی دیتے ہیں۔ کل یہی میرے پیروں میں پڑ کر اپنی جان کی بھیک مانگتے۔ تب میں ان سب کے ساتھ وہ سلوک کرتی کہ ان کی روح تک کانپ جاتی......"

"لیکن یور آنر......! میں نے ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر ایک تیسرا ہی راستہ اپنایا...... بہادری کا راستہ...... یور آنر......! اپنی عزّت و عفّت کو بچانے کے لیے میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ میں ان کا خون کر دوں......"

"یور آنر! اگر آپ کی نظروں میں اپنی عصمت کی حفاظت کرنا جرم ہے تو یقیناً

آپ مجھے پھانسی پر چڑھادیں۔ وہ غنڈے جنھوں نے نہ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہوں گے، نہ معلوم کتنی ابلاؤں کا دامنِ عصمت تار تار کیا ہو گا، کتنے ہی ہنستے کھیلتے گھروں کو ویران کر دیا ہو گا، نہ جانے کتنی مانگوں کا سندور چھینا ہو گا...... اگر آپ اور آپ کا قانون یہی سمجھتا ہے کہ ایسے خطرناک اور انسانیت کے قاتلوں کا خون کر کے میں نے جرم کیا ہے تو بے شک مجھے سزائے موت کا حکم سنا دیجیے۔ میرے ساتھ قطعی کوئی رعایت مت کیجیے۔ میں اپنے کیے پر ہرگز بھی پشیمان نہیں ہوں......"

"اس سماج کو عورت ذات کے لیے مظلومیت، بے چارگی اور لاچاری و بے بسی جیسے الفاظ استعمال کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ یہ ظالم سماج عورتوں کو اسی شکل میں دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے......"

"سماج کے اس فرسودہ ڈھانچے کو بدلنے میں بڑی محنت کے ساتھ ساتھ بہت وقت لگے گا اور جب تک سماج کا موجودہ ڈھانچہ بدلا جائے گا تب تک تو میری جیسی نہ جانے کتنی بے گناہ لڑکیوں کو اس طرح پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے گا...... نہ جانے کتنی بے گناہ اور معصوم لڑکیوں کو ناکردہ گناہوں کا مجرم قرار دے کر سزا کا مستحق ٹھہرا دیا جائے گا، نہ جانے کتنی بے گناہ لڑکیوں کو......" یہ کہہ کر روبی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بھری عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ روبی کی مدلّل تقریر نے عدالت کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر آدمی بڑی خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہا تھا جیسے خاموشی کی زبان میں پوچھ رہا ہو...... دیکھیے عدالت کیا فیصلہ سناتی ہے......؟

کمرۂ عدالت میں موجود ہر شخص دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ عدالت کے فیصلہ کا انتظار کر رہا تھا۔

آخر جج صاحب نے اپنا فیصلہ سنایا— "تمام حالات اور واقعات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد عدالت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ روبیہ خانم بنت جاوید ایک نہایت شریف اور معزز گھرانے کی لڑکی ہے اور روبیہ خانم اپنی سسرال جاتے ہوئے بیچ

سفر میں اس بدترین حادثے کا شکار ہو گئی اور اس نے ان دہشت گردوں کا خون اپنی جان اور عزت بچانے کی خاطر کیا تھا۔ اس لیے یہ عدالت روبیہ خانم بنت جاوید کو باعزّت بَری کرتی ہے اور حکومت سے سفارش بھی کرتی ہے کہ اس کی غیر معمولی جرأت اور بہادری کے صلہ کے طور پر اسے معقول انعام سے نوازا جائے ......"

عدالت کے اس فیصلے پر کمرۂ عدالت میں موجود لوگوں نے اپنی زبردست خوشی کا اظہار کیا......

دوسرے دن اخبارات میں روبی کے دلیرانہ اور بہادرانہ کارنامہ کو جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا حکومت نے عدالت کی سفارش کا احترام کرتے ہوئے اُسے ایک لاکھ روپیہ نقد انعام دیا۔

آج روبی کا گھر ناری آشرم ہے جہاں اس جیسی بہت سی لڑکیاں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اب روبی ان پڑھ لڑکیوں کو پڑھاتی ہے اور اُن کی تربیت میں پورا پورا تعاون کرتی ہے۔

یوں بظاہر اس کی زندگی کے شب و روز پر سکون گزر رہے ہیں وہ ناری آشرم کی دوسری لڑکیوں کے درمیان بیٹھ کر ہنستی بھی ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اُس کی ہر ہنسی کے پیچھے آنسوؤں کا ایک سمندر چھپا ہوا ہے۔ جسے نہ کوئی دیکھ پاتا ہے نہ جان پاتا ہے۔

ملک کے قانون نے تو روبی کو باعزت بَری کر دیا...... مگر یہ ظالم سماج اور...... سماج کے نام نہاد ٹھیکہ دار...... ان سب کی نظروں میں آج بھی وہ گنہگار ہے...... قاتل ہے۔

اپنے سنہرے مستقبل کے وہ خواب جو کبھی اس نے دیکھے تھے۔ وہ سب ایک ایک کر کے بکھر گئے...... ریزہ ریزہ ہو گئے۔

گنہگار روبی نہیں ہے بلکہ یہ ظالم سماج ہے...... اس ظالم سماج کے اندھے قوانین ہیں...... روبی کے ماں باپ ہیں...... شوہر ہے...... یہ سب کے سب فرسودہ اور گلی

سڑی روایتوں کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں......اور ان گلی سڑی روایتوں کو اپنانے میں ہی بہتری سمجھ رہے ہیں......"

آج روبی کی آنکھوں میں اس ظالم سماج کے ظالم ٹھیکہ داروں کے لیے ڈھیر سارے سوالات ہیں......وہ ان سب سے یہ پوچھنا چاہتی ہے ان سب نے مل کر اُسے کس جرم کی سزا دی ہے کیا قصور کیا تھا اس نے......؟ مگر اس کے ماں باپ، اس کا شوہر، یہ ظالم سماج اور اس کے ٹھیکہ دار سب ایک دم خاموش ہیں، سب کے منہ کو جیسے تالا لگ گیا ہے۔

کیا حساب دے پائیں گے یہ سب روبی کی بربادیوں کا، اس کے آنسوؤں کا۔ نہ جانے کب ٹوٹے گی اس ظالم سماج کی خاموشی......اور نہ جانے کب وہ مظلوم روبی کے سوالوں کا جواب دے پائے، نہ جانے کب......؟

□□

خلش

اُف میں تو تمھیں کبھی یاد نہیں کرتی، کبھی بھولے سے بھی تمھارا ذکر اپنی زبان پر نہیں لاتی۔ پھر تم کیوں چلے آتے ہو میرے خوابوں میں، میرے خیالوں میں، میرے جذبوں میں، تمھارے آتے ہی میری اداسیاں بڑھ جاتی ہیں، دَم گھُٹنے لگتا ہے میرا۔ جی چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر سارے زمانے سے اپنی روداِدِ غم کہہ دوں۔ جی چاہتا ہے برباد محبّت کے فسانوں کو عام کردوں۔ خدارا میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میرا بس نہیں چلتا ورنہ میں تمھاری یادوں کو اپنے ذہن سے کھرچ کے پھینک دوں۔ اتنا کھرچوں کہ اس میں سے خون بہنے لگے اور پھر میرا سارا وجود اس خون میں غرق ہو جائے۔ یا پھر میرا جی چاہتا ہے تمھاری یادوں کو کسی بوتل، کسی سمندر کی عمیق گہرائیوں میں پھینک دوں۔ جہاں سے اسے کوئی باہر نہ نکال سکے۔ مگر میں جانتی ہوں تم کتّے بے حیا واقع ہوئے ہو۔ میں تمھیں کہیں بھی پھینک دوں کہیں بھی دفنادوں، تم پھر یادوں کے دریچوں سے جھانکنے لگو گے۔ کبھی منڈیر سے، اوپر چھت پر دیکھتی ہوں تو وہاں بھی دو آنکھیں، گھبرا کر فرش کی جانب دیکھتی ہوں تو وہاں بھی تمھاری مکاّر آنکھیں مجھے اپنے پاس بلاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میرا سر گھومنے لگتا ہے، چکرّ سے آنے لگتے ہیں اور میں پھر سر تھام کر بیٹھ جاتی ہوں۔

رِم جھم رِم جھم پانی برسنے لگا۔ جبین ویسے ہی سر تھامے بیٹھی رہی۔ اس کا تخیل پھر پرواز کرنے لگا۔ برسات کا موسم کس قدر حسین اور دلفریب ہوتا ہے۔ کئی نوجوان آنکھیں اس کا انتظار کرتی ہیں۔ برستے بھیگتے موسم میں اپنے ساتھی کے ساتھ موٹر سائیکل پر چپک کر بیٹھنا۔ چکنی بھیگی سڑک پر بیٹھے بیٹھے بھیگنا اور پھر کسی پیڑ کی چھانوْ

میں لگے ٹھیلے سے گرما گرم چائے پینا۔ پچھلے سال یونیورسٹی میں اس نے کئی مرتبہ امّی سے چھپ کر یہی سب کیا ہے۔ بڑے مزے آتے تھے۔ لگتا تھا ساری دنیا ہماری مٹھی میں ہے۔ جب چاہے گا بڑھ کر آسمان چھو لیں گے۔ لیکن صرف ایک سال بعد ہی دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ وہ اکثر فیضان سے کہتی تھی کہ میرا جی چاہتا ہے کبھی خوب سارا کاجل ڈال کر چھت پر پہنچ جاؤں اور بارش میں بیٹھ کر خوب روؤں۔ یہ بھی کوئی خواہش ہوئی۔ تم شاعر حضرات تھوڑے سے پاگل ہوتے ہو اور وہ فیضان کی اس بات پر اس سے روٹھ جاتی۔ اب اور کسی کے متعلق تو اسے پتہ نہیں مگر خود اسے برستے بھیگتے موسم میں رونا بہت اچھا لگتا ہے۔

''جبین......'' امّی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''دیوانی تمام کپڑے بھیگ گئے ہیں اور تو مزے سے بیٹھی خیالوں کے گھوڑے دوڑا رہی ہے۔ اُٹھ کپڑے بدل لے۔ میں ابھی گرم چائے بھجواتی ہوں۔''

جبین اُٹھ کر کمرے میں آ گئی اور یونہی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ دل نہیں لگا تو اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر چھوٹے چھوٹے بچّے پانی میں چھپ چھپ کر رہے تھے۔ وہ پھر سوچنے لگی۔ اس دِن بھی تو موسم ایسا ہی تھا۔ ۳۱ر اگست کی صبح وہ ایسی ہی دُعا مانگ رہی تھی — کاش اللہ میاں آج ایسی بارش برسے کہ سارا شہر ڈوب جائے۔ ایسی کڑاکے کی بجلیاں چمکیں، ایسی گھنگھور گھٹائیں چھائیں کہ تمھاری شادی ملتوی ہو جائے۔ پروردگار میں نے زندگی میں کچھ نیک کام کیے ہوں تو اس کے عوض میں تو میری یہ دعا قبول کر لے۔ یا پھر تو مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے تاکہ میں اس بھیانک منظر کو دیکھنے سے بچ جاؤں۔

جبین دعا مانگ کر اُٹھی ہی تھی کہ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں سر اُٹھائے آ گئیں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ یا اللہ آج ایسی بارش برسا کہ اس شہر کے باشندوں نے کبھی ایسی برسات نہ دیکھی ہو۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی ہوائیں چلنے لگیں اور بادل اِدھر اُدھر چھٹک گئے۔ کچھ دیر بعد ہی آسمان آئینے کی طرح صاف نظر آنے لگا۔ اُسے اللہ میاں پر سخت غصّہ آیا۔ گویا اللہ میاں، پانی، بادل، ہوائیں، آسمان اور زمین سب اس کے خلاف

سازش میں شریک ہیں۔ اور وہ اللہ میاں سے بھی روٹھ گئی جو جان بوجھ کر اس کے مقدّر میں تاریکیاں لکھ رہا تھا۔ کتنا شوق تھا اسے بارات دیکھنے کا۔ بچپن میں جب بھی کبھی محلّے میں شادی بیاہ ہوتا، وہ اپنی امی کو آگاہ کر کے سوتی تھی۔ امّی جب بھی بارات آئے تو آپ مجھے جگا دیجیے گا۔ دیکھیے ضرور جگایئے گا اور جو کبھی اتفاق سے امی بھول جاتیں تو جبین رو رو کر ہلکان ہو جاتی کہ ہمیں جگایا کیوں نہیں۔ اس کی دیوانگی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے فیضان سے بھی وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی بارات بڑی دھوم دھام سے لے کر آئے گا۔ لیکن ساتھ ہی فیضان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ خدا کے لیے گھوڑے پر بیٹھ کر مت آنا۔ دولہا بالکل گدھا لگتا ہے۔ تم کار میں بیٹھ کر آنا اور خبردار تم آنکھوں میں کاجل تو قطعی نہیں ڈلواؤ گے۔ تمھاری آنکھیں کاجل لگانے سے اور بھی بڑی لگیں گی۔ تم ہو بھی تو سانولے سلونے، کاجل واجل تم پر ذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔ اور وہ ہنس کر جبین کو چڑھانے کے لیے کہتا — نہیں بھئی، ہم تو ڈلوائیں گے کاجل، ہمارا منہ ہم کچھ بھی کریں۔ بیچاری ایک تو بھابھی ہیں۔ وہ رسمِ کاجل کے لیے ہمیشہ سے کہتی ہیں۔ اگر نہیں ڈلواؤں گا تو سوچیں گی کہ میں نیگ کے پیسے بچا رہا ہوں۔ بھئی ہم انھیں ناراض نہیں کر سکتے۔"

اور جبین چڑھ کر کہتی "آپ ہمیں ناراض کر سکتے ہیں، تو ٹھیک ہے آپ بارات لے کر کہیں اور جایئے گا" — "ارے یار تم تو ناراض ہو گئیں۔ اچھا بھئی جو میم صاحب کا حکم۔ مگر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" جبین نے معصومیت سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ میرے حصے کا کاجل بھی تمھیں اپنی آنکھوں میں ڈالنا ہو گا۔ انگلی سے لگانا۔ اتنا سارا۔" فیضان نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "تم تو ہو بھی گوری، قسم سے بہت اچھی لگو گی۔ بالکل ہو ڈاکن کی طرح۔" اور جبین فیضان کو مارنے دوڑتی۔ "اور تم کیا ہو، کالے بھوت۔" "ڈاکن اور بھوت کی جوڑی بہت خوب بہت خوب۔" فیضان سر ہلا کر کہتا۔ اس بات پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

فیضان میں اپنے وعدے کی بہت پکی ہوں۔ تمھاری شادی والے دن میں نے

خوب آنکھوں میں کاجل ڈالا تھا۔ امّی نے جب دیکھا تو بہت ہنسیں۔ "بالکل دیوانی لگ رہی ہے۔ یہ آج تجھے کیا سوجھا۔ یا تو کبھی کاجل کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی یا آج ساری آنکھیں کالی کر ڈالیں۔" جبین نے بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر سارے جہان کا درد سمیٹ کر کہا۔ "امّی ہو سکتا ہے پھر مجھے زندگی میں کبھی کاجل ڈالنا نصیب نہ ہو۔" "اللہ جانے کیا کہہ رہی ہے۔ کیا آنے والے دِنوں میں کاجل بھی اور چیزوں کی طرح بازار سے اُڑ مٹ جائے گا۔ خدا غارت کرے اس سرکار کو، لو اب کاجل بھی مہنگا کر دیں گے۔" امّی نے چھالیا کترتے ہوئے کہا۔ ہائے کتنی بھولی ہیں میری امّی۔ کچھ بھی تو نہیں سمجھتیں کہ اس کی بیٹی پر کیا گزر رہی ہے۔

باہر بینڈ باجوں کا شور تیز ہو رہا تھا۔ وعدہ شکن، بے وفا، دھوکے باز، مکار، فریبی، اس نے دنیا جہان کی گالیاں فیضان کو دے ڈالیں۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی نہیں۔ قربان کر دیا نا مجھے اپنی خاندانی روایتوں پر، چڑھا دیا نا میرے پیار کو صلیب پر۔ انکار نہیں کر سکتے تھے اس شادی سے۔ مگر تمھیں تو اپنی فرمانبرداری دِکھانی تھی۔ ہوں ایک فرمانبردار بیٹا، ایک قابل بھائی، ایک لائق شوہر اور ایک نالائق عاشق۔ جلا دیا نا میرا خرمن۔ میں مرتے دَم تک تمھیں معاف نہیں کروں گی۔ حشر میں ضرور تمھارا دامن پکڑ کر پوچھوں گی کہ میرا قصور کیا تھا؟

بارات کا شور بتا رہا تھا کہ وہ اس کے گھر کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ اس نے دھیمے سے کھڑکی کے پٹ کھولے۔ باجے والا اب ایک گھسا پٹا پرانا گانا جو تقریباً ہر دولہے کی شادی میں ضرور بجتا ہے، 'بہارو پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے...... میرا محبوب آیا ہے' بجا رہا تھا۔

خدا کرے آج آسمان سے سرخ دہکتے ہوئے انگارے برسیں کہ تمھاری بارات جل کر خاک ہو جائے۔ تمھاری دُلہن کو تمھارا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر دھندلانے لگا۔ یہ کمبخت آنسو بھی کیا چیز ہیں۔ خوشی ہو یا غم، خبیث چلے آتے ہیں بن بلائے مہمانوں کی طرح۔ اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں پونچھیں تو آنکھوں کا سارا کاجل ہاتھوں پر لگ گیا۔ تمھاری دلہن کے ہاتھ آج

مہندی سے سرخ ہوں گے اور جبین تمھارے ہاتھ سیاہ نہیں تمھارے مقدّر کی طرح تاریک۔ اس نے بڑی حسرت سے اپنی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فیضان کے چہرے پر سفید کلیوں کا سہرا سجا تھا۔ وہ بغور اسے دیکھنے لگی۔ میں نے تمھیں بہت چاہا تھا۔ اپنے آپ سے بھی زیادہ۔ مگر تم نے مجھے کیا صلہ دیا۔ میرے خوابوں کو جلا کر کسی اور کی زندگی میں روشنی کرنے چل دیے۔ خدا کرے یہ سہرے کی لڑیاں سانپ بن کر تمھیں ڈس لیں۔ مر جاؤ تم گھوڑے سے گر کر۔ ٹانگیں ٹوٹ جائیں تمھاری۔ ٹپ ٹپ کر کے بے شمار آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ خدایا میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔ آخر فیضان مجھے کیوں نہیں ملا۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ اگر تجھے ہمیں ملانا ہی نہیں تھا تو ہمارے عشق کو کیوں پروان چڑھایا۔ کیوں...... کیوں۔ وہ بے اختیار دیوار سے سر مارنے لگی۔

'بس بس جبین، یہ کیا پاگل پن ہے؟' اس کے اندر سے آواز آئی 'جسے تو مرنے کی دعائیں دے رہی ہے۔ وہ کبھی تجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اب وہ تیرا نہیں ہے۔ اس پر تیرا کوئی حق نہیں ہے۔'

'وہ صرف میرا ہے میرا۔' اور چیخوں کے ساتھ اس کی ہچکیاں بھی تیز ہونے لگیں۔ بارات اس کے گھر کے سامنے سے گزر گئی تھی۔

فیضان درحقیقت تو اسی دن جبین کی زندگی سے بھی چلا گیا تھا۔ مگر اس کا تصوّر، اس کی یادیں اب بھی جبین کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ فیضان کے چلے جانے سے اس کی تو دنیا ہی تاریک ہو گئی تھی۔ کیسے کیسے خواب بنے تھے اس نے اپنی آنے والی زندگی کے لیے۔ اس نے تو اپنے بیٹے کا نام بھی سوچ لیا تھا۔ ساحل رکھوں گی میں اپنے بیٹے کا نام۔ سین سے رکھوں گی اس کا نام۔ ''تمھیں پتہ ہے اس سین سے جس کا نام ہوتا ہے نا، وہ تھوڑے سے سنکی ہوتے ہیں۔'' فیضان اسے چڑھانے لگا'' بھئی نام تو وہی رکھنا جو ہم میں ملتا ہو مثلاً عرفان، فرقان، غفران۔''

''جی نہیں اب یہ فیشن نہیں ہے قافیہ ملانے کا۔'' ''تو اب کیا ملاتے ہیں؟''

”تمھارا سر“ وہ شرما کر اس کے سینے میں سر چھپالیتی۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اس کے ساتھ ایسا بھیانک سلوک کرے گی۔ اسے فیضان سے نفرت ہے شدید نفرت...... وہ اس کے گھر کے نزدیک ہی تو رہتا تھا۔ اکثر پتنگوں کے بہانے وہ بھی بھائی کے ساتھ چھت پر پہنچ جاتی۔ امّی کی نظریں بچا کر سوکھے کپڑوں کو پھر سے گیلا کر کے وہ چھت پر سکھانے کے بہانے جمی رہتی۔ آمنے سامنے ہی تو تھے ان کے کمرے۔ اکثر فلمی انداز میں لائٹ جلانا اور پھر آف کرنا دونوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ کوڈورڈ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو یاد کر رہے ہیں۔

ہماری محبّت کی پہلی عید پر تم میرے لیے چوڑیوں کے علاوہ ایک اور چیز بھی لائے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ وہ چیز تم اپنے ہاتھ سے مجھے پہناؤ گے۔ تم مجھے پہنا تو نہیں سکے تھے، مگر تمھاری دی ہوئی چیز پہن کر میں نے تمھیں بالکل اپنے دل کے قریب محسوس کیا تھا۔ لڑکیاں اکثر جذباتی اور بیوقوف ہوا کرتی ہیں اور لڑکے اکثر انھیں پٹانے کے لیے اسی طرح کے تحفے دیا کرتے ہیں۔ آج سے بیس سال پہلے اس قسم کے تحفے شوہر اپنی نئی نویلی دلہن کے لیے ہی خرید کر لاتے تھے لیکن آج کل بوائے فرینڈ لڑکیوں کو عید، دیوالی اور ویلن ٹائن ڈے پر اسی قسم کے تحفے دیتے ہیں۔ آج تمھارے دیے ہوئے اس تحفے کو بھی میں نے قینچی سے کتر کتر کر پھینک دیا ہے۔ میرا بس نہیں چلتا ورنہ تم نے جہاں جہاں میرے جسم کو ہاتھ لگایا تھا، جی چاہتا ہے ہر اس حصے پر گرم گرم چمٹا چپکا دوں۔ دھوکے باز۔

تمھارا گھر قریب ہے نا اسی لیے اُدھر کی ہر بات اڑ کر اِدھر پہنچ جاتی ہے۔ بچا جنا ہے تمھاری بیوی نے، حرامزادی، مر کیوں نہیں گئی زچگی میں۔ دو رکعت نماز ادا کرتی۔ جبین نے پھر فیضان کو کوسا۔ تمھارا اپلہ بھی تم پر جائے گا حرامی کی اولاد۔ اسے فیضان اور اس کے بیوی بچوں کو کوس کر ایک ذہنی سکون ملتا تھا۔ ایسا سکون جسے صرف وہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے ابھی تک اس کے بچّے کو نہیں دیکھا تھا۔ امّی تو اب بھی اپنے ہمسایہ ہونے کا حق نبھا رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ بچّے کا نام فیضان نے

ساحل رکھا ہے۔ جل بھن ہی تو گئی تھی وہ۔ کوئی دوسرا نام نہیں ملا اس کمینے کو۔ اُسے اس شخص کے ذکر سے بھی نفرت تھی۔ وہ اس شہر سے اب کہیں دُور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ امّی کے منع کرنے کے باوجود وہ بی ایڈ کرنے کے لیے اجمیر آگئی اور وہیں ہوسٹل میں داخلہ لے لیا۔

اجمیر میں جبین کے شب و روز مصروف رہنے لگے۔ فیضان کی یادیں اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ گزارتی۔ کبھی منٹو کا 'مینا بازار' خرید لاتی تو کبھی عصمت چغتائی کی خود نوشت 'کاغذی ہے پیرہن' تو کبھی جواہر لال نہرو کی 'ڈسکوری آف انڈیا'۔ ان دِنوں ہندی لٹریچر سے متعلق ناول 'مجھے چاند چاہیے' اور دھرم ویر بھارتی کا 'گناہوں کا دیوتا' بھی اس نے پڑھ ڈالا تھا۔ دوسروں کی خود نوشتیں پڑھ پڑھ کر اسے لگتا تھا کہ کبھی وہ اپنی خود نوشت لکھے تو، کتنے اتار چڑھاؤ ہیں اس کی زندگی میں۔ لیکن اس کے جیسی گمنام شخصیت کی خود نوشت کون پڑھنا پسند کرے گا اسی لیے اس نے اپنا ارادہ کینسل کر دیا تھا۔ یوں شاعری کا اسے بچپن سے ہی شوق رہا ہے۔ بچے کھچے وقت میں غزلیں کہتی، افسانے لکھتی اور یوں اس کے دو سال گزر گئے تھے۔ جب کبھی امّی یا فیضان کی یادیں زیادہ پریشان کرتیں تو وہ رکشہ لے کر درگاہ چلی جاتی۔ زیارت کر کے نماز ادا کرتی پھر کبھی ناظم صاحب کے گھر چلی جاتی تو کبھی چہل قدمی کرنے آنا ساگر کی طرف۔

آج امّی کا خط آیا تھا— 'فوراً چلی آؤ بھائی کی شادی طے ہو گئی ہے۔' امّی کو اجمیر کا حلوہ سوہن بہت پسند تھا۔ ان کی فرمائش تھی کہ وہی حلوہ سوہن لانا جو داڑھوں میں چپکے نہیں۔ چنانچہ اس نے سب سے اعلیٰ درجے کا حلوہ سوہن پیک کرایا۔ اجمیر سے بذریعہ بس جے پور کا راستہ بمشکل ڈھائی تین گھنٹے کا ہی ہو گا۔ سفر چھوٹا سا تھا۔ وہ بغیر کسی پریشانی کے جے پور پہنچ گئی۔

امّی اسے دیکھ کر نہال تھیں۔ اس کی پسند کی تقریباً سبھی چیزیں بریانی، گاجر کا حلوہ، ارہر کی دال اور آلو بھرے گرما گرم پراٹھے۔ امّی نے بہت کچھ بنا لیا تھا۔ اس نے ڈٹ کر کھایا اور پھر لمبی تان کر سو گئی۔

بھیاں بھیاں...... کسی بچّے کے زار و قطار رونے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُٹھ کر دیکھا تو امّی ایک خوبصورت گول مٹول بچّے کو گود میں لیے چپ کرا رہی تھیں۔ ''او...... او...... او۔ کا ہوا میلے بٹو کو۔ کیوں لو لہا ہے۔''جبین نے امّی کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہے یہ بیچارا؟ پہلے تو کبھی یہاں نہیں دیکھا۔'''' دیکھتیں کیسے تم تو یہاں تھی ہی نہیں دو سال سے۔ اچھا جاؤ تو ذرا ننھے کے لیے کچن سے دودھ بنالاؤ۔ اور ہاں اس میں ذرا سا پانی اور شکر ضرور ملا دینا۔'' بی جبین نے دوپٹہ الگنی پر ڈالتے ہوئے کچن کی جانب قدم بڑھایا۔ دودھ کو نیم گرم کر کے اس نے بوتل میں ڈال دیا۔ '' لیجیے۔'' اس نے بوتل امّی کو پکڑا دی۔ ''تم پلا دو، میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔''امّی ننھے کو اس کی گود میں دے کر نماز پڑھنے چلی گئیں۔ جبین نے اسے پچکار کر بوتل منہ سے لگادی۔ وہ منٹوں میں ہی غڑپ غڑپ کر کے سارا دودھ پی گیا۔ بچّے جبین کو بہت پسند تھے اور یہ بچّہ تو تھا بھی خوبصورت۔ وہ اسے اُچھال اُچھال کر کھیلنے لگی۔ ''اچھا تو یہ بدمعاش تم سے بھی مانوس ہوگیا۔''امّی نماز سے فارغ ہو گئی تھیں۔ انھوں نے جانماز تہہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''اس کا باپ بھی تو ایسا ہی تھا۔ شادی سے پہلے تو دِن رات کی آمد و رفت تھی ہمارے گھر پر۔'''' کون ہے اس کا باپ۔'' جبین نے اپنے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''ارے بھئی فیضان اور کون۔''اس کے پیروں کی زمین دھنسنے لگی۔ تو یہ اس کمینے کی اولاد ہے۔ اس نے گھور کر بچّے کو دیکھا۔ ''امّی ایک بات بتایا۔ یہ آپ کو کب سے بچوں کا شوق ہوگیا۔'''' تم اور تمھارا بھائی تو باہر رہتے ہو۔ یہ بھاڑ سا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ بھلا ہو فیضان کی بیوی کا جو ساحل کو یہاں بھجوا دیتی ہے۔ میرا دِل بھی اس ننھے کی وجہ سے لگا رہتا ہے۔''اب وہ امّی کو کیا کہتی کہ اس بچّے کو گھر میں گھسنے مت دیا کرو۔ سانپ کی اولاد، وہ دِل ہی دل میں دانت بھینچ کر بڑبڑائی اور دھڑام سے جا کر بستر پر پسر گئی۔ جبین کے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کوئی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ ''اُٹھو جبین مغرب کا وقت ہوگیا ہے۔ ورنہ اب رات کو نیند نہیں آئے گی۔'' وہ شاید روتے روتے سو گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا، نظر دوڑائی۔ بچّہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے سکون کی سانس

لی۔ شاید وہ اپنے گھر جا چکا تھا۔

وہ کیا کرے، فیضان کی محبت ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔ اس نے بارہا چاہا کہ فیضان کے لیے دل میں بسی ہوئی نفرت کو نکال پھینکے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ آج بھائی جان آرہے تھے۔ امّی نے اپنے بڑھاپے کا واسطہ دے کر آخر انھیں شادی کے لیے منا ہی لیا تھا۔ ماں بیٹیاں دونوں اس کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ شیراز نے اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی پوری کر لی تھی لیکن وہ یہاں نہ رہ کر اپنے دوست کے ہمراہ اس کے ہوسپٹل میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔

جبین خوش تھی۔ سب کچھ بھلا کر وہ بھائی سے ملنے کے لیے بیتاب تھی۔ وہ اس کے ہر راز میں شریک رہتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی محبّت کی راز دار بھی تھی۔ دراصل شیراز جبین کی سہیلی نائلہ کو چاہتے تھے۔ امّی کے ذریعہ دونوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ نائلہ تھی بھی بڑی پیاری لڑکی خوبصورت انٹلی جینٹ۔ وہ اپنی ریسرچ مکمّل کر کے یونیورسٹی میں لکچرار ہو گئی تھی۔ امّی کو شیراز اور نائلہ کی محبّت کا علم تو نہیں تھا لیکن جبین کی سہیلی ہونے کی وجہ سے وہ اس سے اور گھر والوں سے اچّھی طرح واقف تھیں۔ بھائی آئے تو جیسے گھر میں بہار آگئی۔ امّی نے ان کی پسند کی بھی ہر چیز بنائی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیا وجہ تھی کہ بھائی بجھے بجھے اور خاموش سے تھے۔ کھانے کی میز پر بھی وہ بس ٹونگتے رہے۔ آخر رات کو کھانے کے بعد جب وہ ٹی وی دیکھ رہے تھے تو جبین نے انھیں جا پکڑا۔ ”کیا بات ہے بھائی، شادی ہو رہی ہے پھر بھی خاموش سے ہیں۔“ بھائی نے اس کے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے دوسرا سوال اسی سے پوچھ ڈالا۔ ”کیا تم جانتی ہو میری شادی کس سے ہو رہی ہے“ —— ”نیچرلی نائلہ سے اور کس سے“ —— ”نہیں جبین۔“ شیراز نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”مطلب میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں“ —— ”یہی کہ میں نائلہ سے شادی نہیں کر رہا ہوں“ —— ”تو پھر کس سے کر رہے ہیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ محبت کے ہزار عہد و پیمان کر کے اب آپ نائلہ سے بے وفائی کر رہے ہیں“ —— ”تم سمجھتی نہیں جبین میں بے انتہا مجبور ہوں“ —— ”آخر میں بھی تو سنوں بھائی آپ کی کیا مجبوری ہے۔“

"امّی کو تو تم جانتی ہو وہ اپنی زبان کی کتنی پکی ہیں۔ مجھے تو خبر بھی نہیں وہ خالہ امّی سے نیرہ کو اپنی بہو بنانے کا وعدہ کر آئی ہیں۔ مجھے نہیں پتہ امّی نے ایسا کیوں کیا۔ مجھ سے بغیر پوچھے میرا رشتہ طے کر دیا"— "طے کر دیا تو کیا ہوا آپ کہہ دیجیے کہ آپ نے ان سے پہلے اپنا رشتہ نائلہ سے طے کر لیا تھا۔ اور آپ اسے زبان دے چکے ہیں"— "میں امّی سے بات کر چکا ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کی زبان کے آگے میری زبان کا کوئی مول نہیں ہے"— "مول کیسے نہیں ہے۔ نائلہ کو جو آپ نے خواب دکھائے ہیں ان کا کیا ہوگا؟"— "جبین مجھے پتہ ہے یہ نائلہ کے ساتھ زیادتی ہے۔ مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ امّی کی واحد اُمّیدوں کا سہارا میں ہوں۔ وہ کہہ چکی ہیں کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں مانی تو وہ زہر کھا لیں گی۔" جبین کو اپنی سیدھی سادی ماں پر شدید غصہ آیا۔ "میں ابھی امّی سے جا کر بات کرتی ہوں"— "کوئی فائدہ نہیں ہے بہن۔" شیراز نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ نہیں مانیں گی گھر کا ماحول اور خراب ہوگا"— "لیکن میں ضرور بات کروں گی۔ امّی کہاں ہیں۔" آپ وہ دندناتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔ "آخر آپ اس طرح کا فیصلہ کس طرح کر سکتی ہیں۔" امّی کو شاید ان تمام باتوں کا علم تھا جو بھائی اور میرے درمیان ہوئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے بڑی تسلّی سے مجھ سے پوچھا۔ "کون سا فیصلہ؟" مجھے ابھی بھی سخت غصہ آ رہا تھا۔ "یہی کہ آپ بھائی جان کی شادی نائلہ سے نہ کروا کر نیرہ سے کروا رہی ہیں"— "اس لیے کہ نائلہ ہمارے ماحول میں کہیں فٹ نہیں بیٹھتی۔"

"اچھا کس طرح؟ کل تک تو آپ اس کی تعریفوں کے پل باندھتی نہیں تھکتی تھیں، پھر آج کیوں کیڑے نکال رہی ہیں"— "میں ابھی بھی کہتی ہوں کہ نائلہ اچھی لڑکی ہے"— "تو پھر یہ اچھی لڑکی آخر آپ کی بہو بننے کے لائق کیوں نہیں ہے۔"

"اس لیے کہ مجھے برقعہ اوڑھنے والی ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی چاہیے۔ نائلہ چونکہ سروس کرتی ہے، اس لیے میرا یقین ہے کہ وہ اپنے بچّوں کی تربیت اچھی طرح نہیں کر سکتی۔ میں نے دیکھا ہے سروس کرنے والی لڑکیاں اپنے گھر کا خیال نہیں رکھتیں

اور ساس کو جوتے کی نوک پر بٹھاتی ہیں۔ مجھے اپنا بڑھاپا خراب نہیں کرنا"—"تو آپ نے مجھے سروس کی اجازت کیوں دی۔ میں بھی تو برقعہ نہیں اوڑھتی"—"تم بیٹی ہو تمھیں پڑھا لکھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کرنا میرا فرض تھا۔ تمھیں بیاہ کر کہیں اور جانا ہوگا پھر تم جانو اور سسرال والے"—"آپ کا مطلب یہ ہے کہ میرا مستقبل میرے سسرال والوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ چاہیں گے تو میں سروس کروں گی، وہ چاہیں تو میں برقعہ اوڑھوں گی۔ آخر کس لیے، یہ زندگی میری اپنی ہے اور اس کی بہتری کے لیے جو بھی فیصلہ کرنا ہوگا وہ میں خود کروں گی۔ زندگی ان کی ہے اس لیے اپنی شادی کا فیصلہ بھی انھیں کرنے دیجیے۔ اب آپ یہ بھی کہیں گی کہ میں ایک اچھی ماں ثابت نہیں ہوسکتی"—"میں نے ایسا نہیں کہا ہے۔ آمنہ بیگم نے جبین کو دیکھتے ہوئے کہا۔"ٹھیک ہے آپ نے مجھے تو نہیں کہا مگر نائلہ کو تو کہا ہے نا۔ پہلے آپ اسے ایک اچھی بیوی بننے کا موقع تو دیجیے۔ وہ پڑھی لکھی ہے، یقیناً ایک اچھی ماں بھی ثابت ہوگی۔ نپولین نے کہا تھا تم مجھے ایک پڑھی لکھی ماں دو میں تمھیں ایک پڑھی لکھی نسل دوں گا۔ امّی، جہاں تک میں سمجھتی ہوں بات صرف اتنی ہے کہ آپ ایک روایتی ماں کی طرح بلا وجہ بھائی جان کی مخالفت کر رہی ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے آپ سے پوچھ کر محبت نہیں کی۔ آپ اس طرح کیوں نہیں سوچتیں کہ نائلہ کی جگہ میں ہوتی اور اگر محبت میں کوئی مجھے اس طرح دھوکہ دے کر اپنی ماں کی پسند سے کہیں اور شادی کر لیتا تو؟"—"تو میں اس شخص کو زندہ ہی زمین میں گاڑ دیتی۔ ہمارے خاندان کی عزّت سے کھیل کر کوئی بھی شخص زندہ نہیں بچ سکتا"—"تو پھر آپ اپنے بیٹے کو زمین میں گڑوانے کے لیے تیار ہو جایئے۔ نائلہ کے چار بھائی ہیں۔ انھیں بھی اپنے خاندان کی عزّت پیاری ہے۔"

"لڑکی جو منہ میں آتا ہے بکے جاتی ہے۔ میں اپنی بہن کو زبان دے چکی ہوں۔ شیراز کی شادی وہیں ہوگی"—"آپ کی زبان دو محبت کرنے والوں کی زندگی سے بڑی نہیں ہوسکتی۔ امّی، بھائی نائلہ سے شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ ان کی زبان، ان کے ارمان اور ان کی خواہشوں کا کیا ہوگا۔ آپ کان کھول کر سن لیجیے اگر بھائی کی شادی نائلہ سے نہیں ہوئی تو میں خیر شادی میں تو شریک ہوؤں گی ہی نہیں بلکہ یہ گھر بھی چھوڑ کر

چلی جاؤں گی۔ دو سال تک میں آپ سے دُور رہی ہوں، ٹھیک ہے اب تمام زندگی صحیح۔"
آمنہ بیگم یہ سُن کر سُن رہ گئیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ کیا یہ وہ وہی جبین ہے، جس کو رات رات بھر جاگ کر انھوں نے بڑے نازوں سے پالا ہے۔ جبین نے پھر ان پر ایک اور وار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ سوچ رہی ہوں گی میں بڑی احسان فراموش ہوں۔ جس ماں نے پال پوس کر بڑا کیا ہے اسے ہی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ صدیوں سے سارے والدین یہی کہہ کر بچوّں کو دھمکاتے آئے ہیں۔ والدین اپنے بچوّں کی پرورش نہیں کریں گے تو کیا پڑوسیوں کے بچوّں کو پالیں گے۔ زمانے کی یہی ریت ہے۔ آپ نے ہمیں پالا، ہم اپنے بچوّں کو پالیں گے۔ نسل در نسل انسان یہ قرض چکاتا آیا ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، انسان یہ قرض چکاتا رہے گا۔ ہم بھی چکائیں گے۔ لیکن ہم اپنے بچوّں کے ارمانوں کا خون کبھی نہیں کریں گے۔ اپنی مرضی ان پر کبھی نہیں تھوپیں گے۔ میں ایک آئیڈیل ماں بنوں گی۔ آپ کی طرح زبان کی غلام نہیں۔" تڑاخ ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس کے گالوں پر پڑا۔ جبین ایک ٹک انھیں دیکھتی رہی اور پھر اسی عزم سے کہا۔ "میں جا رہی ہوں، آپ رہیے گا اپنی بہو کے ساتھ۔"

یہ کہہ کر جبین اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور سامان بھرنے لگی۔ "کیا ہوا جبین؟" شیراز نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ نہیں بس روانگی" — "میں نے کہا تھا نا بہن امّی نہیں مانیں گی" — "نہ مانیں، میں نے کوشش کر لی۔ اب میں یہاں ایک پل بھی نہیں رُکوں گی۔ کم از کم نائلہ کو منہ دِکھانے کی جگہ تو رہے گی۔"

"جبین!" آمنہ بیگم اسے آواز دے رہی تھیں۔ "یہاں آؤ۔"

"جی۔" اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ امّی اپنے بیڈ روم میں تھیں۔ سامنے بیڈ پر زری کی ساڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ "تمھیں کون سی ساڑی پسند ہے۔" وہ جل بھن ہی تو گئی۔ "کوئی سی بھی نہیں۔" جبین نے بڑی ناراضگی سے جواب دیا۔ "بھئی بتاؤ کون سی ساڑی پہنو گی؟" — "کیوں پہنوں مجھے نہیں پہننا ہے کچھ بھی" — "ہائے تو کیا تم بغیر کپڑوں کے نائلہ کے گھر جاؤ گی" — "بھئی ہمیں تو بہت شرم آئے

گی"—— "کیا آپ مان گئیں۔" جبین نے حیرت سے کہا۔ "ہاں مانتی کیوں نہیں، میری پیاری پڑھی لکھی بیٹی نے جو سمجھایا تھا"—— "امّی۔" وہ پیار سے ان سے لپٹ گئی۔ "اچھا چھوڑو مجھے۔ جاؤ تیاّر ہو جاؤ۔ ہم شیراز کے لیے نائلہ کا رشتہ مانگنے چل رہے ہیں۔" اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کے پنکھ لگ جائیں اور وہ اپنی پیاری سہیلی کو جلد سے جلد دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئے۔ وہ اپنے کمرے میں تیار ہونے جا ہی رہی تھی کہ دروازے کی کال بیل بج اٹھی۔ جبین نے دروازہ کھولا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ سامنے اپنے لڑکے کو گود میں لیے فیضان کھڑا تھا۔ "کیا مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" اس کے پیر دو دو من ہو کے وہیں جم گئے۔ بڑی مشکل سے دروازے سے ہٹتے ہوئے اس نے فیضان کے لیے جگہ بنائی۔ اسے ہزاروں گالیاں دینے والی پتہ نہیں کیوں آج اس قدر خاموش کھڑی تھی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔ معافی مانگنے آیا ہوں جبین۔ اپنے والد کے آگے بہت مجبور ہو گیا تھا۔ انھوں نے میری پھوپھی کو زبان دے دی تھی۔ میں والد کا دل نہیں دُکھا سکتا تھا۔" مجھ میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ اپنی محبّت کا اقرار ان کے سامنے کر سکتا۔ جبین کے سامنے اپنے بھائی کا مجبور چہرہ اُبھر آیا جو اپنی ماں کی خاطر ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنی محبّت کو قربان کر رہا تھا۔ اس نے بھری بھری آنکھوں سے نظریں اُٹھا کر فیضان کی جانب دیکھا۔ کیا اتنا کہہ دینے سے ہی تلافی ہو جائے گی۔ "جاؤ......" اس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "میں نے تمھیں معاف کیا۔" اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے فیضان کی گود سے بچّے کو لے کر جبین نے چوم لیا۔ "مجھے تو اپنی محبت نہیں مل سکی لیکن میں اپنے بھائی کو اس کی محبت دلانے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔" جبین نے جاتے ہوئے فیضان سے کہا۔ "رُکیے اب چائے پی کر ہی جایئے گا۔" اتنے میں امّی اپنے بیڈ روم سے نکل آئیں"—— "بھئی چائے کیا، فیضان ایک مدّت بعد گھر آیا ہے، اسے کھانا کھلاؤ۔ نائلہ کے یہاں اب ہم لوگ کل چلیں گے۔ کھانا تو میں کھلا دوں گی۔ لیکن ایک شرط ہے۔ اس گول مٹول منّے کی ممّی کو بھی لے کر آیئے اور یہ اب تبھی واپس ملے گا جب مسز فیضان یہاں آئیں گی۔"

جبین نے واقعی فیضان کو معاف کر دیا تھا۔ آج وہ اس کی بیوفائیوں کو بھلا کر اس

کی بیوی کے استقبال کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ جبین نے اپنے دل سے آج اس خلش کو نکال پھینکا تھا جس کی وجہ سے اس کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔ ننھے ساحل کو سینے سے چپکائے وہ سوچ رہی تھی کہ اگر پہلے ہی فیضان کو معاف کر دیتی تو یہ دو سال جو شدید کرب میں گزر رہے ہیں وہ بھی سکون سے گزر جاتے۔

□□

ایک قدم اور

محبت ظالم ہوتی ہے اور بعض اوقات مہربان بھی۔ انسانی عمل اور ردِّ عمل محض جسمانی تغیرات کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ اس کے پیچھے بہت سی ذہنی اُلجھنیں اور پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ ذہنی الجھنیں بعض اوقات اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ انسان کا دماغی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہ ذہنی اُلجھنیں مجموعہ ہیں چند یادوں کا جو تلخ بھی ہیں اور شیریں بھی جو سکون بخش بھی ہیں اور دردناک بھی، جو خوشنما بھی ہیں اور بدرنگ بھی۔ غرض محبّت میں جو چیزیں پہلے غیر اہم معلوم ہوتی ہیں وہی آگے جاکر نہایت اہم بن جاتی ہیں۔ محبّت کی یہ یادیں حقیقت سے دُور بھی ہیں اور قریب بھی۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ انسان چاہ کر بھی ان یادوں کو کیوں بھلا نہیں پاتا۔ کیوں یہ احساس بن کر دل و جاں میں سما جاتی ہیں؟ شاید اس لیے کہ جو چیز زندگی میں مل نہیں پاتی اس کی کسک ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ”کیا ہوا شیریں! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ضیغم نے اس کے نزدیک سرکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ میں نے زبردستی آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ میرے میاں ہیں۔ تقریباً دس سال سے میں ان کے ساتھ ہوں۔ میں کہاں رہی ہوں میرا جسم رہا ہے ان کے ساتھ۔ دل تو میں ہندوستان میں ہی جواز کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ اس شخص نے بھی تو کبھی اس دِل کو پانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ہیں اور ان کے لاتعداد مریض۔ اس نے ترچھی نظر سے ضیغم کی جانب دیکھا۔ خاصے معقول سے آدمی ہیں ضیغم۔ بقول امّی جان کے سب کچھ تو ہے ان کے پاس۔ ایک خوبصورت فلیٹ، ایک

گاڑی، چمچماتے ہوئے زیور، اور ایک بے ہنگم سی شخصیت، جو ہمیشہ دماغوں کا علاج کرتی ہے، جسے دل کے زخم کبھی نظر نہیں آتے۔

زز بھئی کیا سوچ رہی ہو؟ پھر کسی کہانی کا پلاٹ ذہن میں گھوم رہا ہو گا۔"

"ہاں! یونہی کچھ سوچ رہی تھی۔" میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"اُف! شیریں کبھی تو اپنی اس خیالی، افسانوی اور تصوّری دنیا سے باہر آنے کی کوشش کیا کرو۔"

"ضیغم کیا اب تم میرے خیالات پر بھی پابندی عائد کرو گے۔ تم کیا میں تو خود بھی اپنے تخیلات پر پابندی نہیں لگا سکتی۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"ضیغم تم نے کبھی اسٹریم آف کونشیس نیس (Stream of consciousness) کے متعلق پڑھا ہے؟ خیالات کی رو، بہاؤ......"

"میں ایسی فضول کی بکواس نہیں پڑھتا۔ تم نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ ایک ہندوستانی ادیبہ نے اس ٹیکنک کو اپنے ناولوں میں اپنایا تھا۔"

"ہاں قرۃ العین حیدر نے اسے اپنایا تھا۔"

"تو اس اسٹریم آف کونشیس نیس کا ذکر یہاں کیسے آگیا۔ یار تم عجیب و غریب باتیں کرتی ہو۔ یہ فلاسفی کم از کم یہاں تو رہنے ہی دو۔ اپنا موڈ ٹھیک رکھو۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ہم ہندوستان کی سرزمین پر ہوں گے۔"

"خواتین و حضرات! اب ہمارا جہاز چند ہی لمحوں کے بعد دہلی کے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اُترنے والا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ کا سفر ضرور خوشگوار گزرا ہو گا۔ پھر بھی اگر کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ آپ حضرات مہربانی کر کے اپنی حفاظتی سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔"

امریکن ایئر ہوسٹس کے اس اعلان کے ساتھ ہی تمام مسافروں میں ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ آخر کار وہ اپنے وطن واپس آرہے تھے۔ ان میں سے کچھ کھو کر آئے تھے اور کچھ کھوئے ہوؤں کو پانے۔ وہ بھی تو یہاں کچھ کھو کر گئی تھی۔ پتہ نہیں وہ اس بھیڑ بھرے شہر کی کن گلیوں میں ہو گا۔

امریکن ایئر ہوسٹس پھر اسکرٹ لہراتی ہوئی اس کے قریب سے گزری۔ سفید موتی جیسا رنگ، آنکھوں پر نیلا آئی شیڈ اور ڈارک ریڈ لپ اسٹک۔ کل ملا کر بڑا ہی ڈرامائی انداز پیدا کر رہا تھا اور اس پر نیم عریاں جسم۔ اسے امریکن عورتوں سے سخت نفرت تھی۔ حقیقتاً اسے اس ملک، وہاں کے باشندوں، وہاں کے کلچر اور تو اور اسے تو بل کلنٹن سے بھی حد درجہ نفرت تھی جو آئے دن پاکستان کو ہندوستان کے خلاف اکساتا رہتا تھا۔ بدذات غریب ملکوں پر اپنی دادا گیری جماتا رہتا ہے۔ میرے خیال سے مونیکا سیکس اسکینڈل میں جس قدر امریکہ کے بل کلنٹن بدنام ہوئے ہیں اتنا کوئی اور لیڈر نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے نفرت سے منہ سکیڑا۔ ایئر ہوسٹس اپنے چاکلیٹی دانتوں کو بار بار مسکرا کر نمایاں کر رہی تھی۔ لاکٹ بلاؤز میں سے اس کا نیم عریاں جسم جھانک رہا تھا۔ اسے بے اختیار اپنے دودھ والے کی بیوی یاد آگئی، جو ماتھے پر سرخ بندی سجائے، سفید چمچاتے دانتوں سمیت بڑی دلکش مسکراہٹ سے کہتی تھی "دودھ لائی ہوں بی بی۔" گھاگرے اور چولی میں اس کا کسا ہوا بدن بڑا حسین لگتا تھا۔ اس پر کمر میں بندھی کرگھنی اور اس میں اٹکا چابیوں کا گچھا۔

کاش دودھ والے کی بیوی کنتی ایئر ہوسٹس بن جائے۔ کتنا اچھا لگے گا۔ لال کناری کا بارڈر والا گھاگرا، ہاتھوں میں بھر بھر کلائیاں لاکھ کی چوڑیاں، جنھیں ہندوستان میں سہاگ چوڑہ بھی کہا جاتا ہے۔ ماتھے پر سرخ چونی جتنی بندی لگائے وہ ہنس ہنس کر تمام مسافروں کو دودھ پیش کر رہی ہے۔ شیریں نے آنکھیں بند کیں اور اپنی اس غیر ممکن سی سوچ پر مسکرا پڑی۔ مجھے فخر ہے اپنے ہندوستانی ہونے پر، اپنے کلچر پر "جے ہند" اس نے دل ہی دل میں اپنے ملک کو سلام پیش کیا۔

امریکہ میں ہر روز صبح اُسے ایک منحوس چہرہ دیکھنا پڑتا تھا۔ کال بیل بجتے ہی وہ سمجھ جاتی تھی کہ دروازے پر ایلس ہوگی۔ ابھی اپنے سفید خشک جھریوں بھرے چہرے سے آنکھیں چمچماتے ہوئے کہے گی یور ملک بوتل (Your milk bottle) اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دودھ کی بوتل اس کے سر پر دے مارے۔ کاش امریکہ میں اسے کوئی ہندوستانی دودھ والی اور باورچن مل جاتی۔ یہ کلچر کا تضاد اسے ہمیشہ پریشان کیے رہتا تھا۔ اسے

حد درجہ نفرت تھی امریکہ سے۔ اس ملک کی چکا چوندھ نے اس کے گھر والوں کی عقل پر سنہرا پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ تو امریکہ آنا ہی نہیں چاہتی تھی، لیکن گھر کے قیمتی ساز و سامان کی طرح اسے جبراً یہاں منتقل کر دیا گیا۔

شیریں آج دس سال بعد پہلی مرتبہ اپنے گھر ہندوستان جا رہی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح ان آنکھوں کا سامنا کرے گی جو دس سال سے اس کی راہ تک رہی ہوں گی۔ کتنے لاتعداد ساون گزرے ہیں، ان آنکھوں سے۔

یہ کمبخت تو اب رونا بھی بھول گئی ہیں۔ خشک ہو گئے تھے سب چشمے۔ لیکن آج وہ آنکھوں کے اس سیلاب کو روک نہیں پائے گی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ کھڑکی کے اور قریب ہو گئی اور باہر کے منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔

شہر کی روشنیاں جگنوؤں کی مانند لگ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی ماضی کی دو قندیلیں روشن ہو گئیں۔ کیسا ہو گا میرا جواز؟ اس نے پھر کھڑکی ۔ سے نیچے جھانکا۔ کون سا علاقہ ہو گا یہ اندازہ لگانا تو مشکل تھا لیکن وہ جس علاقے سے بھی گزر رہی تھی وہ تھا تو اس کا اپنا وطن۔ جہاں جواز کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے وہ اس شہر کی چوڑی سڑکوں پر بے خوف گھوما کرتی تھی۔ جہاں اس کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر سکھ دکھ کے سبھی موسم ساتھ ساتھ گزارنے کے عہد و پیماں کیے تھے۔ ہوں...... اپنا شہر اس نے ایک طویل گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر پھر خیالوں میں ڈوب گئی۔۔ اپنا شہر جہاں وہ رہتا تھا، جہاں کے لوگ اسے احمد جواز کے نام سے جانتے تھے، جو فلاسفی میں ریسرچ کر رہا تھا۔ اس کا ساتھی، اس کا دوست، اس کا محبوب، اس کا غمگسار، اس کا گھر بالکل قریب تھا۔ اور جواز اس کے گھر سے بھی بہت قریب اس کے دھڑکتے ہوئے دل میں رہتا تھا۔

وہ ہر روز یونیورسٹی ساتھ ساتھ جایا کرتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت کرنا، ادبی کانفرنسوں میں شامل ہونا، بحث و مباحثہ اور تبصرے، یہی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یاد ہے شیریں کو وہ آخری ملاقات، جب وہ یونیورسٹی کے لان پر بیٹھی تھی کہ اچانک ہی جواز نے آکر پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

مگر یہ کیا شیریں کی آنکھوں میں شوخی کی جگہ نمی تیر رہی تھی۔ ”کیا بات ہے جان کیوں اداس ہو؟“

”تمھیں کیا تم تو بس ہر وقت اپنی فلاسفی میں ڈوبے رہتے ہو۔ بہت بڑے فلاسفر ہو نا، ہر بات کو فلسفیانہ انداز میں سوچتے ہو۔ میں نے پہلے بھی کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جا کر میرے گھر والوں سے بات کرو۔ مگر تم ہو کہ میری باتیں ہوا میں اُڑا دیتے ہو۔ آج پھر ضیغم کے والدین آئے تھے۔ امّی نے انھیں ایک ہفتے بعد آنے کے لیے کہا ہے۔ تمھیں پتہ ہے میرا پاسپورٹ بھی بن گیا ہے۔“

”دیکھو شیریں محبت اور شادی دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ میں یہ نہیں مانتا جس سے محبت ہو اُسی سے شادی بھی کی جائے۔ محبت شادی سے بہت بالاتر ہے۔“

”جواز یہ فلمی مکالمے میرے سامنے نہیں بولو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ محبت کسی اور سے اور شادی کسی اور سے۔ کیا تم اسے کوئی کھیل سمجھ رہے ہو۔ کیوں نہیں صاف صاف کہہ دیتے کہ تم مجھ سے محبّت نہیں کرتے ہو۔“ اتنا کہتے ہی شیریں کی آنکھوں سے جھر جھر موتی برسنے لگے۔

جواز نے بڑی عقیدت سے وہ موتی اپنے رومال میں جذب کر لیے۔ اور قطعی غیر جذباتی انداز میں بولا۔ ”شیریں محبّت واقعاتی ملاپ سے بالاتر ہے اور پھر ......“

”بس بس، اپنا یہ فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ میرے سامنے بگھارنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ شیریں نے غصّہ سے کہا۔

”سنو تو میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھ سے بڑی میری بہن ہیں جو ابھی تک کنواری بیٹھی ہیں۔ بھلا ان سے پہلے میں کس طرح اپنا گھر بسا لوں۔“

”جب وقت آئے گا تو ان کی شادی بھی ہو جائے گی۔ ان کے سہرے کے پھول بھی کھل جائیں گے۔“ شیریں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”وہ وقت پتہ نہیں کب آئے گا۔“ جواز نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”اب تو وہ عمر کی اس دہلیز پر کھڑی ہیں جہاں تمام آرزوئیں دَم توڑ دیتی ہیں۔ جن کے چہرے پر وقت نے بدصورتی کی مہر لگا دی ہو۔ بھلا وہ کیوں کر کسی کے خوابوں میں بسیں گی۔

کون اپنائے گا انھیں؟"

"تو کیا ایسی بہنوں کے بھائی شادی نہیں کیا کرتے ہیں؟"

"ضرور کرتے ہوں گے، لیکن میں ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا جس سے ان کی مایوسیوں میں اور اضافہ ہو جائے اور وہ مزید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں۔ اس کے علاوہ میرے سپر وائزر، جن کی زیرِ نگرانی میں ریسرچ کر رہا ہوں، ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ اگر میں دل لگا کر پی ایچ ڈی مکمل کر لوں تو وہ مجھے اسی ادارے میں لیکچرار شپ دلوا دیں گے۔ پھر جب حالات سدھر جائیں گے تو ہو سکتا ہے باجی کے ہاتھ بھی پیلے ہو جائیں۔"

"لیکن جواز ان سب باتوں کے لیے تو کم از کم تین سال کا عرصہ درکار ہو گا۔ میں ٹھہری لڑکی ذات جو پیدا ہوتے ہی ہندوستانی والدین کے لیے بوجھ بن جاتی ہیں۔ میں آخر اپنے گھر والوں کو کیا کہہ کر تسلّی دوں۔ میں تو تمام عمر انتظار کرنے کے لیے راضی ہوں مگر امّی وہ تو ایک ہفتے سے زیادہ ہرگز بھی نہیں رُکیں گی۔"

"شیریں میں نے تو پہلے ہی تمھیں اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ تم ابھی پریشان ہو گھر جاؤ اور آرام سے میری باتوں پر غور کرو۔ ابھی محبت میں بھوکے رہ کر دن گزار لو گی مگر شادی ہوتے ہی تمھارا پیٹ دو وقت کی روٹی مانگے گا۔ میں فی الوقت اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ دونوں کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکوں۔ امید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گی۔"

اور اس ایک بات کو سمجھنے کی کوشش کے نتیجے میں شیریں کو شیریں ضیغم بننا پڑا۔

ان دِنوں ضیغم امریکہ سے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ ہماری امّی کی پیاری سہیلی کے پیارے بیٹے، جنھیں شادی کرنی تھی تو ہمارے گھر میں۔ امّی نے اس کی ناراضگی جاننے کے باوجود اس کے پیروں میں اپنا دوپٹہ ڈال دیا۔ مجبوراً اس نے اس دوپٹے کو تعظیم کے ساتھ سر پر اوڑھ لیا اور شادی کر کے امریکہ جا بسی۔ ضیغم ایک اچھے شوہر تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کے مریض، دواؤں او، ہاسپٹل کی بدبو کی عادی ہو گئی۔ ایسا نہ تھا کہ ان دس سالوں میں اس نے جواز کو بھلا دیا تھا۔ بیوی وہ ضرور ضیغم کی تھی مگر محبوبہ تو وہ

اب بھی جواز ہی کی تھی۔ وہ باقاعدہ ضیغم کی بیوی کے تمام فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتی۔ ہاں جواز کی یادوں پر ضرور وقت کے ان بیتے لمحوں کا گرد و غبار جم گیا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ وہ ہندوستان لوٹے، مگر ہر بار کوئی نہ کوئی مجبوری درپیش آگئی۔ اسے یاد ہے کہ جب امّی کا اچانک ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا لیکن ضیغم کو چھٹیاں نہیں مل سکیں۔ اس نے دل کو یہی کہہ کر تسلّی دے دی تھی کہ ویسے بھی والدہ کا چہرہ تو دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔ اب جانے سے بھی کیا فائدہ۔ پھر اسی طرح ضیغم کے کسی عزیز کا انتقال ہوا تھا تو پھر وہی صورتِ حال تھی۔ اب ضیغم کو چھٹّیاں ملی تھیں۔ وہی ضد کر بیٹھے کہ ہندوستان چل کر اپنے عزیزوں سے ملیں گے۔

''فلاسفر صاحبہ کیا سوچ رہی ہیں۔ اٹھیے تمام مسافر اُتر رہے ہیں۔'' اس وقت شیریں کو ہوش آیا کہ وہ دہلی آچکی ہے۔ کیا وہ بھی آیا ہو گا اسے لینے۔ اس نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے سوچا۔

سبھی رشتے دار تو آئے تھے اسے لینے۔ آنکھوں میں بے شمار شکوے شکایتیں اور ہاتھوں میں پھول مالائیں۔ وہ سب اس کے گلے سے لپٹ گئے۔ وہ مسکرا مسکرا کر سب سے گلے مل رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں اس بھیڑ میں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن وہ چہرہ اسے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ شیریں کو سخت مایوسی ہوئی۔

گھر پہنچ کر اس نے کھانا کھایا اور سر درد کا بہانہ کر کے کمرے میں لیٹ گئی۔ ڈرائنگ روم سے اس کی بہنوں کے قہقہے اور گفتگو کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیچ میں اس کا مظلوم سا بیگ رکھا تھا، جس کا باقاعدہ آپریشن کیا جا رہا تھا کہ کس کے لیے کیا سوغات آئی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کیے سوچا۔ اے کاش اسے کوئی خود بخود بتا دے کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیا وہ بھی اسے اتنا ہی یاد کرتا ہو گا۔ اس نے حسرت سے سوچا۔ اب تو شاید اس کے بھی بچّے ہوں گے۔ خوبصورت سی بیوی ہو گی، اور اب تو شاید اس کی بہن کی بھی شادی ہو گئی ہو گی۔ اس نے بیزاری سے کروٹ بدلی۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی تو پھر صبح ہی کھل پائی۔

اٹھتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ سامنے والی کھڑکی تھی۔ اس

نے لپک کر جھٹ کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سامنے جواز کا گھر تھا۔ صبح اٹھتے ہی پہلے دونوں اشاروں سے ایک دوسرے کو سلام کرتے۔ اشاروں اشاروں میں اس روز ملنے کا وقت طے ہوتا اور پھر وہ نہانے کے لیے جاتی۔ مگر آج سامنے والے کمرے کی کھڑکیاں نہیں کھلیں۔

دن میں وہ اور ضیغم شہر میں گھومنے نکل گئے۔ بہت سے مقامات دیکھے۔ ضیغم ہر چیز سے مسرور تھے۔ وہ بہت دلچسپی سے سب کچھ دیکھتے۔ مگر وہ خود ہر جگہ پہنچ کر پہلے سے زیادہ بیزار ہو جاتی۔ وہ ادھر اُدھر گھومتی رہتی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کنج کے پیچھے سے جواز ابھی نکل کر اسے بانہوں میں تھام لے گا۔ اس نے حسرت سے درختوں کی گھنی گھنی ڈالیوں کی جانب دیکھا۔ شاید جواز اس درخت کے پیچھے چھپا ہو اور اسے محض پریشان کرنے کے لیے سامنے نہیں آ رہا ہو۔

شام کو کھانے سے فارغ ہو کر اس نے کموّ آپا سے، جو امّی کے زمانے سے ہی باورچی خانہ سنبھالے ہوئے تھیں، ان سے پوچھ ہی لیا۔ ”بڑی بی وہ جو ہمارے سامنے جواز رہتا تھا نا وہ کہاں ہے آج کل؟“

”بی بی تمھاری شادی کے چند دن بعد وہ لوگ یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب پتہ نہیں کہاں رہتے ہیں۔“

یا خدا اب میں اس کو کہاں ڈھونڈوں، کہاں تلاش کروں؟ میں کیوں اس کے لیے اتنی بے چین ہوں۔ آخر اب اس سے میرا رشتہ ہی کیا ہے؟ میں سمجھ نہیں پاتی آخر اس کا خیال بار بار ذہن کو کیوں پریشان کرتا ہے اور خصوصاً جب سے اس نے اس سر زمین پر قدم رکھا ہے، ایک مستقل بے قراری دل کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اور وہ تکیے میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

شام کو پھر وہی ہجوم، بڑی مشکل سے رات نو بجے جب سب ملاقاتی جا چکے تو وہ ضیغم کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔ ٹیلی فون کے پاس ہی ڈائریکٹری رکھی تھی۔ بے اختیاری طور پر وہ احمد جواز کا نام تلاش کرنے لگی۔ آخر کار اس کا نام نظر آ ہی گیا۔ پروفیسر احمد جواز ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ آف فلاسفی۔ ہو نہ ہو یہ وہی ہے۔ میرا

جواز اس نے بے قراری سے سوچا۔ کیا کروں، اس وقت فون کرنا مناسب ہو گا کیا؟ اس کی بیوی کیا سوچے گی۔ اگر اس نے فون اٹھایا تو کیا وہ اس کی بات کروا دے گی۔ شیریں نے دروازے کی جھری سے جھانکا۔ ضیغم بدستور اپنی سالیوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ پھر فون کے نزدیک بیٹھ گئی۔ یہ کمبخت دل کیوں دھک دھک کر رہا ہے۔ اسے لگا وہ پھر سے بائیس سال کی دوشیزہ بن گئی ہے۔ حسرت، اندیشے اور وحشت تینوں نے مل کر اس کی شخصیت میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ مجھے کسی کی پرسکون زندگی میں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ دس سال کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس نے بھی تو کبھی میرے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ ہوں بے وفا، دھوکہ باز، مکّار فلاسفر۔

غیر ارادی طور پر اس کی انگلیاں ڈائل کرنے لگیں 360394 ٹرن ٹرن...... ٹرن ٹرن...... گھنٹی کے ساتھ ساتھ اُس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہونے لگیں۔ اس نے ریسیور کو کان کے اور قریب کر لیا۔

Come on pick up the phone

پلیز فون اُٹھاؤ نا۔ پھر اچانک ہی کریڈل سے ریسیور اُٹھانے کی آواز آئی۔ اسے لگا کہ اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ "ہیلو!" ایک پروقار مردانہ آواز نہایت دھیمے لہجے میں سنائی دی۔ شیریں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی دھڑکنوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہی ہے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ "ہلو...... میں...... میں...... بول...... رہی ہوں۔"

بہت زور لگانے کے باوجود اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ آنسوؤں کا ایک سخت سا گولا جیسے اس کے حلق میں کہیں پھنس گیا ہو "...... ہیلو...... ہیلو......" ادھر سے دو مرتبہ دہرایا گیا اور پھر فون کٹ گیا۔

شیریں نے آنکھوں تک آئے ہوئے آنسوؤں کو روکا نہیں۔ کیوں کہ رو دینے والی بات پر کھل کر رو لینا چاہیے۔ اس نے آنسو پونچھے، ہمت کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر نمبر ڈائل کیے۔ "ہیلو......" جواز کی آواز کانوں سے ہوتی ہوئی دل میں

اتر گئی۔ اس نے اپنے وجود کی تمام تر طاقت سمیٹ کر کہا۔ ”کیا میں پروفیسر احمد جواز سے بات کر سکتی ہوں!“

دوسری جانب سے جو آواز سنائی دے رہی تھی، اس میں خوشی کے ساتھ ساتھ حسرت کا شائبہ زیادہ تھا۔

”شیریں تم!“

اور شیریں کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر زمین تک جھول گیا۔ ”میں...... میں آرہی ہوں جواز......“ اس نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔ ایک پل میں جیسے تمام ناراضگیاں ختم ہوگئیں۔ اور دوسرے ہی پل وہ ڈرائنگ روم میں تھی۔ اسے یوں تیار دیکھ کر ضیغم نے تعجب سے پوچھا۔ ”کہاں جارہی ہو اتنی رات کو؟“

”رات کہاں میری تو پورے دس سال بعد صبح ہوئی ہے۔“

”جب سے آئی ہو میں تم میں چند تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں۔ اب یہ کیا عجیب و غریب باتیں کررہی ہوں......“

”کہیں تم......“

”میں پاگل نہیں ہوئی ہوں۔“ شیریں نے بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔ ضیغم مجھے جانے دو۔ میری روح اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ پلیز مجھے مت روکو۔“ اس نے بیتابی سے بات پوری کی۔

پتہ نہیں ضیغم کچھ سمجھا یا نہیں، لیکن اس نے کار کی چابی شیریں کی طرف بڑھادی۔

دوسرے ہی لمحے کار فراٹے بھرتی ہوئی دہلی یونیورسٹی ٹیچرس ہوسٹل کی جانب دوڑی جارہی تھی۔

□□

وہی قربتیں وہی فاصلے

کھڑے کھڑے میرے پیر دکھنے لگے تھے۔ گرمی کی شدّت سے منہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ بار بار دوپٹے سے پسینہ پوچھتی ہوئی، میں یہی دُعا مانگ رہی تھی اللہ کوئی ٹیکسی بھیج دے۔ یہ ۱۰ منٹ کا وقفہ کافی طویل ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں دس سالوں سے ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میرا پیشہ بڑا ہی واہیات سا ہے۔ بس خبروں کے پیچھے دوڑتے رہو ڈر لگتا ہے کبھی زندگی خود کوئی خبر نہ بن جائے۔ میں نے پھر تپتی ہوئی انگارے اُگلتی سڑک کی جانب دیکھا۔ گرد و غبار کے اُڑتے ہوئے بادلوں میں ایک ٹیکسی دوڑتی ہوئی میری سمت چلی آ رہی تھی۔

"کتھے جاؤ گی بی بی؟"

"مالویہ نگر پولیس اسٹیشن۔"

"تسی بیٹھو جی آرام سے۔ ہو میری گڈی سون چریا۔" وہ دھیمے دھیمے گنگنانے لگا...... "ہو...... میری ٹیل پری......" اردو اور پنجابی کی یہ آمیزش مجھے اندر تک مسرور کر گئی۔ ایک زمانے میں مجھے پنجابی سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ راجستھان یونیورسٹی کے ایم فل بیچ میں ہم آٹھ لڑکیاں اور آٹھ لڑکے تھے۔ جب بھی ہم برآمدے سے زینہ اتر کر کینٹین جاتے، فلاسفی ڈپارٹمنٹ کے پاس کارنر پر ایک سردار اکثر ٹکرا جاتا تھا۔ او جی تسی اردو ڈیپارٹمنٹ بڑا مست ہے۔ اسی بھی کبھی چائے وائے پلاؤ کڑیے۔

ہم لڑکیاں اکثر گروپ بنا کر پیچھے چلتی تھیں اور ہمیشہ ہی لڑکوں کے بعد سیڑھیاں اترتی تھیں۔ اس سے دو فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو آخری بچی ہوئی تین سیڑھیوں پر

سے دھم سے کودنا اور دوسرے آگے چلتے ہوئے لڑکوں پر کمینٹ پاس کرنا۔ اس سردار کا آخری جملہ ہم لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جاتا تھا۔ اس کی زبان کی مٹھاس مجھے ہمیشہ متاثر کرتی تھی۔ میرا بھی جی چاہتا تھا کہ میں پنجابی زبان میں بات چیت کروں۔ اس زمانے میں ٹی وی پر کئی پنجابی سیریل آتے تھے جسے دیکھ کر کچھ پنجابی الفاظ ہم بھی سیکھ گئے تھے۔ ہم تینوں بہنیں جب چائے پیتیں تو میز سے کپ اُٹھا اُٹھا کر ایک دوسرے کو دِکھاتیں۔ 'تُسی چائے پیو جی۔' اپنے اکلوتے بھائی کو بھائی جان کی جگہ ہم ویر جی کہتیں۔ امّی تو کہتی بھی تھیں کہ لڑکیاں ہندو ہوتی جا رہی ہیں۔ راکھی پر ہم نے پنجابیوں کی طرح سر پر اونچے جوڑے باندھ کر بھائی جان کی کلائی پر راکھی باندھی تھی۔ امّی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ہم نے ان سے سو سو روپے بھی زبردستی چھین لیے تھے۔ میرے اس پنجابی زبان کے عشق کی دیوانگی کے بڑھتے گھر والوں نے میرا نام ہی منیرہ سے من پریت کور رکھ دیا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں لائبریری سے لوٹ رہی تھی۔ ہاتھ میں اشو(Issue) کی ہوئی ڈھیر ساری کتابیں اور کاندھے پر جھولتا بیگ، اپنی ہی دھن میں غزل گنگناتی 'موسم آئیں گے جائیں گے ...... ہم تم کو بھول نہ پائیں گے۔ ہوں ہوں ...... ہوں ہوں ...... 'یکایک میں کسی سے ٹکرائی ...... اور آنکھوں پر چڑھا دھوپ کا چشمہ سڑک کی دھول پھانکنے لگا۔ ''اندھے ہو کیا خبیث؟'' — ''اوئے جو اندھا ہوتا تو بھی تسی نال نال چلتا۔'' میں نے نظریں اٹھائیں۔ ''اوہ معاف کیجیے گا سردار جی آپ، میں نے دیکھا نہیں تھا'' — ''تسی چائے پلاؤ گی کڑیے'' — ''شیور'' (Shure) میں نے چشمہ اور کتابیں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ میرا اچھا دوست بن گیا تھا۔ ہم اکثر فرصت کے اوقات کینٹین یا لائبریری کے کامن روم میں ملا کرتے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ کر میں اکثر خوفزدہ ہو جاتی تھی کہ یہ جذبہ کبھی اپنی منزلوں کو نہ پا سکے گا۔ ہمیشہ پُرخار، پتھریلے راستے ہمارے ہمسفر ہوں گے۔ حالانکہ اس نے کبھی میرے سامنے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ لیکن جس سے محبت کی جائے اس سے کچھ نہ بھی کہا جائے

تو آنکھیں سرگوشیوں میں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ محبت کی اس اِک طرفہ آگ میں جل کر وہ خود کو برباد کرلے اور خاک ہو جائے۔ میرا ایم فل کا ریزلٹ آگیا تھا۔ میں اپنی کتابیں اور دوسرا ضروری سامان پیک کر رہی تھی کہ وہ آدھمکا۔ ''جا رہی ہو؟''—— ''ہاں پڑھنا ہے نا اس لیے جانا تو پڑے گا ہی۔ تم دل لگا کر محنت کرنا اور جلد از جلد تھیسس مکمل کرنا''—— ''تم مجھے کوئی تحفہ نہیں دو گی؟

''کیوں بھلا میں کوئی حج کرنے جا رہی ہوں جو سب کو تحفے بانٹتی پھروں۔'' وہ بدستور رنجیدہ رہا۔ میرے مذاق کا گرجیت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ''اچھا بولو تو تمھیں کیا تحفہ چاہیے؟''

''وہ۔'' اس نے اس الماری میں سرخ جزدان لپیٹے ہوئے قرآن شریف کی طرف اشارہ کیا۔

مجھے سخت حیرت ہوئی۔ ''تم کیا کرو گے؟ تمھیں تو اسے پڑھنا تک نہیں آتا''—— ''میں اسے پڑھوں گا۔'' اس نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔ ''میں اسلام دھرم قبول کرلوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں پھر محبت کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ میں نے نظریں بچاتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیوں اپنی بی جی سے ہمیں جوتے کھلواؤ گے کہ میرے پُتر کو بگاڑ دیا۔''

''...... چھوڑو تمھارے بس کی بات نہیں ہے میاں بھائی بننا۔''

''نہیں منیرہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تم پاگل ہو۔'' میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اسلام دھرم قبول کر بھی لو گے تو بھی وہ سب ممکن نہیں ہو گا اس لیے اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

دل کوئی دُکان نہیں ہے جس کا فائدہ یا نقصان سوچا جائے''—— ''ٹھیک ہے مت سوچو مگر تمھاری یہ لوجک ایک دن دیکھنا تمھیں برباد کر کے چھوڑے گی۔'' اس نے لاپروائی سے میری باتوں کو اَن سنا کرتے ہوئے کہا۔ ''سب کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہے۔''

"تم جسے جینا کہہ رہے ہو وہ مرنا ہے۔"

"جو بھی ہو یہ قرآن شریف مجھے دے دو۔"

"میں شام کو تمھیں ہندی ترجمے والا قرآن شریف لادوں گی۔"

وہ میری باتوں سے کچھ مطمئن نظر آیا۔

دوسرے دِن وقتِ مقررہ پر گرجیت اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے لال جزدان میں لپٹا قرآن شریف اس کی جانب بڑھادیا۔ اس نے تعظیم کے ساتھ اسے چوما اور سینے سے لگالیا۔

"یہ میں تمھارے لیے بھی کچھ لایا ہوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے ایک پولیتھین بیگ میری جانب بڑھادیا۔ "اسے بعد میں کھولنا۔"

"اچھا۔" میں نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کر کہا۔ میرا ہاتھ برابر ٹرین کی کھڑکی سے ہل ہل کر اسے بائی بائی کہہ رہا تھا۔

وہ بھی مجھے مسلسل اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ میں نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ میں نے بیگ کھول کر دیکھا اس میں "گرومکھی" کا اردو ترجمہ تھا۔ جس طرح ہماری مقدّس کتاب قرآن شریف ہے، سرداروں کی مقدّس کتاب "گرومکھی" ہوتی ہے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بیگ بند کر کے میں دہلی کے متعلق سوچنے لگی۔

دلی کے اسٹیشن پر ٹرین رُکی تو لوگوں کا سیلاب اور گرمی کے تیور دیکھ کر جی چاہا کہ اُلٹے پیر جے پور کی راہ لوں۔ میں نے منہ بسورتے ہوئے بیگ اُٹھایا اور رکشے پر بیٹھ گئی۔ اُف خدایا دہلی کے رکشے بھی کس قدر عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ان کی سیٹس نیچے ڈھلان کی جانب جاتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں۔ میرے لاکھ ہینڈل پکڑنے کے باوجود تمام وجود قدموں کی جانب بڑھتا ہوا محسوس ہوتا۔ اللہ کہاں پھنس گئی۔ منزل تک پہنچتے پہنچتے تو پتہ لگے گا کہ میرے قدموں میں اپنا ہی ڈھیر لگا ہے۔ اس سے تو ہمارے جے پور کے پھوٹے کھرے ہی اچھے ہیں۔ لاکھ اوبڑ کھابڑ اور ٹوٹے پھوٹے ہیں، مگر رکشا کی بناوٹ ایسی کہ کیا مجال جو آپ گر جائیں۔ خیر صاحب خدا خدا کر کے میری

منزل آئی۔

دھیرے دھیرے وقت گزرنے کے ساتھ دہلی کی بے ترتیب بھیڑ کی میں عادی ہو گئی۔ خوش قسمتی سے جرنلزم کے دوران مجھے ایک اخبار میں سروس بھی مل گئی۔ آج تقریباً دو سال ہو رہے ہیں۔ اس عرصہ میں شروع میں چھ مہینے تک ہماری خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر میری مصروفیات کہہ لیں یا لاپروائی گرجیت سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ٹیکسی اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے میٹر دیکھ کر پیسے چکائے۔ تمام سیڑھیاں اور کاریڈور طے کر کے میں آخری کمرے تک آ گئی تھی۔ یہی ہے انچارج صاحب کا آفس؟ میں نے نیم پلیٹ پڑھی۔ "کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟"

"آیئے آیئے۔" انھوں نے خوش اسلوبی سے کہا۔ "میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے پاس اجازت نامہ ہے؟" —— "ہاں جی" —— "ٹھیک ہے۔" انھوں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک سپاہی سے کہا۔ "میڈم کو بلونت سے ملوا دو۔ لیکن خیال رکھیے گا اس کی دماغی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ ہم تو کیس کو پاگل خانے کو ریفر کرنے والے تھے۔ چلیے اچھا ہوا آپ آ گئیں۔"

میں جب بیرک میں داخل ہوئی تو تیس بتیس سالہ ایک خاتون چٹائی پر نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ یکایک اُٹھ بیٹھی۔ "جاؤ یہاں سے، تم مجھے مارنے آئی ہو۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔" یہ کہتے کہتے وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ "میں مجرم نہیں ہوں۔"

"کس نے کہا تم مجرم ہو؟" مجھے اس سے ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ میں کرسی لے کر بالکل اس کے قریب بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وہ عورت سچ بول رہی ہے۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تم نے اپنے شوہر پر چاقو سے قاتلانہ حملہ کیا تھا" —— "میں سچ کہتی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔" درحقیقت کیس کی اصلیت کیا ہے؟ اس کا علم تو مجھے بھی نہیں تھا۔ کل صبح اخبار میں اس کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر پڑھی تھی، دہلی یونیورسٹی میں اس کے شوہر فلاسفی ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ ایک دن کسی

بات کو لے کر دونوں میاں بیوی میں جھگڑا ہوا اور بیوی نے غصّے میں آکر چاقو سے وار کر دیا۔ شوہر کی آنتیں زخمی ہوگئی تھیں۔ اور وہ ہوسپٹل میں زیرِ علاج تھا۔ جبکہ بلونت کور کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ واردات کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ اس کے شوہر کی ایسی حالت نہیں تھی کہ وہ بیان دے سکتا۔

پولیس یہ مان کر چل رہی تھی کہ بلونت نے جان بوجھ کر اپنے شوہر پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، لیکن پولیس کی سخت پوچھ تاچھ بھی اس سے حقیقت نہیں اگلوا سکی تھی۔ پولیس کا یہ بھی ماننا تھا کہ بلونت دماغی طور پر اس حادثے سے کہیں نہ کہیں اثرانداز ہوئی ہے۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت میرا دِل اس عورت کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔ میرا ضمیر گواہی دے رہا تھا کہ کوئی بھی ہندوستانی عورت اتنی ظالم نہیں ہوسکتی کہ اس بے رحمانہ طریقے سے اپنے شوہر کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔

اس دن تو میں چلی آئی۔ دوسرے دِن وکیل سے مل کر میں نے بلونت کی ضمانت کے کاغذ تیار کرائے۔ تھانے پہنچ کر ہم نے کاغذات دکھائے اور بلونت کو لے کر میں اپنے گھر آگئی۔ تمام راستے وہ خاموش اور خوف زدہ سی رہی۔

میں بلونت کا پورا خیال رکھتی۔ کچھ ہی دِنوں میں وہ پہلے سے بہتر نظر آنے لگی۔ میں نے اسے اپنے متعلق بتا دیا تھا اور میں اس کوشش میں تھی کہ وہ اپنی زبان کھولے تاکہ مجھے واقعہ کا علم ہوسکے۔ ایک دِن یونہی میں دل بہلانے کے لیے اسے اپنا فیملی البم دِکھا رہی تھی۔ یہ میرے امّی ابوّ ہیں، یہ چھوٹی بہنیں، یہ بھائی۔ اچانک ایک تصویر کو دیکھ کر وہ یکایک خاموش ہوگئی۔ کیا اُس تصویر کو گھورے جا رہی تھی۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ کہیں پھر اس کے دماغ پر تو اثر نہیں ہو رہا۔ ''کیا ہوا تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟'' میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''یہ...... یہ تصویر یہاں کیسے آئی۔'' اس کا اشارہ ایک گروپ فوٹو میں میرے نزدیک کھڑے گرجیت کی جانب تھا۔ ''ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ مگر تم ان کے متعلق کیوں پوچھ رہی ہو؟'' --- ''یہ میرے شوہر ہیں۔'' اس نے البم سے آنکھیں اُٹھا کر میرے چہرے کی جانب دیکھا۔

چھناک۔ مجھے شیشے کی چند کرچیاں اپنے دل کے اِرد گرد چبھتی ہوئی سی محسوس

ہوئیں۔ حالانکہ میں نے کبھی گرجیت سے محبّت نہیں کی تھی۔ نہ ہی اس کی بیوی بننے کے خواب دیکھے تھے۔ مجھے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی دلی کیفیت چھپانے کے لیے میں بے انتہا ضبط کر رہی تھی۔ اور اس ضبط کی کوشش نے میرے چہرے کا رنگ اُڑا دیا تھا۔ اب بلونت کور ایک مجسّم سوال بن کر میرے سامنے کھڑی تھی۔

''آپ کسی من پریت کور کو جانتی ہیں؟''

میرے کانوں کے نزدیک بم پھٹا۔ ایک بار تو میں پوری طرح لرز گئی۔ ''نا...... نہیں......'' میں نے خوبصورتی سے جھوٹ بولتے ہوئے اپنے اوپر قابو پالیا تھا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ حال کی منیرہ ماضی کی من پریت ہی تو تھی۔

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ مجھے بتاؤ میں تمھاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم دونوں میں اتنے اختلافات کیسے ہوگئے کہ تم نے گرجیت پر بے رحمانہ طریقے سے چاقو سے وار کر دیا۔'' اس کے چہرے پر بیچارگی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ ''میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے تسلّی دی۔ ''روؤ مت، مجھے بتاؤ آخر کیا ہوا تھا۔'' کچھ دیر بعد اس کے آنسو تھم گئے۔ وہ خلا میں اس طرح گھورنے لگی جیسے کہانی کا کوئی سرا تلاش کر رہی ہو۔

''تقریباً ایک سال پہلے ہماری شادی چندی گڑھ میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ہم دونوں دہلی آگئے۔ آٹھ دس دن بعد ہی مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ ہمارے رشتے کو لے کر کچھ پریشان سے ہیں۔ شادی کے لیے یہ راضی نہیں تھے، اس کا مجھے علم تھا۔ مگر ان کے والدین کی طرح میں بھی یہی سوچتی تھی کہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں ہر وقت یہ کوشش کرتی تھی کہ انھیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ مجھے اس بات کی قطعی خبر نہیں تھی کہ شادی سے پہلے یہ کسی اور لڑکی سے محبّت کرتے تھے۔ اس کا انکشاف مجھ پر ان کی ڈائری دیکھنے کے بعد ہوا۔ اس میں من پریت کور کے نام لکھے ہوئے کئی خطوط تھے۔ شادی کے بعد بھی یہ اکثر اپنے خوابوں میں اسے بسا کر اس کی یاد میں ورق سیاہ کرتے رہتے تھے۔ مجھ سے یہ بالکل برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں حقیقت ہو کر بھی ان سے کوسوں دُور تھی اور وہ خواب ہو کر بھی ان کی رگِ جاں میں سمائی ہوئی

تھی۔ مجھے تو اکثر شک ہوتا تھا کہ وہ چھُپ چھُپ کر اس سے ملتے بھی ہیں۔ رات دن مسلمانوں کی دھارمک کتاب کو سینے سے لگائے رہتے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا تھا وہ چھپ چھپ کر نماز بھی پڑھتے تھے۔ واہے گرو مجھے تو کبھی کبھی شک ہوتا تھا کہ ان کا دھرم بھرشٹ ہو گیا ہے۔ اکثر ان کی انھیں باتوں کو لے کر ہم میں جھگڑا ہوتا تھا۔ میں انھیں ان کی ان دھرم وِرودھی باتوں سے روکتی تھی......"

"......ایک دِن پھر ہمارا انھیں باتوں کو لے کر جھگڑا ہوا۔ نزدیک میں میز پر سبزی کے ساتھ چھری رکھی ہوئی تھی۔ روز روز کی اس چِق چِق سے تنگ آ کر میں نے خودکشی کے ارادے سے چھری اُٹھالی۔ وہ مجھے روک رہے تھے اور میں بضد تھی۔ آخر چھینا جھپٹی میں وہ حادثے کا شکار ہو گئے۔ میں سچ کہتی ہوں یہ سب انجانے میں ہوا ہے۔"

میں بھی تو انجانے ہی اس کہانی میں ویمپ بن گئی تھی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ میری محبّت میں وہ یوں دیوانہ ہو کر اپنی زندگی برباد کر لے گا۔ اس کی آنکھوں میں محبّت کے ٹھاٹھے مارتے سمندر کو دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ ایک دن یہ لہریں طوفان بن کر اسے لے ڈوبیں گی۔ آج پتہ لگا، جسے میں محبّت کا ایک ننھا سا پودا سمجھتی تھی وہ تناور درخت بن چکا تھا۔ محبّت جب کسی کے دل میں گھر کر لیتی ہے تو برگد کی طرح جڑ پکڑ لیتی ہے۔ ایک شاخ کو کاٹ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ہزارہا شاخیں اِردگرد کی زمین کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتی ہیں۔

میں نے تہیّہ کر لیا۔ میں ان کو ہرگز جدا نہیں ہونے دوں گی۔ دوسرے دِن ہم دونوں اسپتال گئے۔ "کیسے ہیں آپ؟"

آج گرجیت کو ڈسچارج سرٹیفکیٹ مل رہا تھا۔ مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنی تھی۔ موقع ملتے ہیں میں پھٹ پڑی۔

"گرجیت آخر تم نے اپنی زندگی تباہ کر ہی لی۔ اب کیا حاصل ہوا؟ محبت کچھ حاصل کرنے کے لیے نہیں کی جاتی۔"

"پھر وہی فلاسفی، اتنا کچھ لٹانے کے بعد بھی تم اس نامراد محبت کا پلو تھامے ہو۔ ذرا بلونت کی طرف دیکھو آخر اس کا کیا قصور ہے؟"

”اور میرا کیا قصور تھا؟“

”میں نے تمھیں پہلے بھی سمجھایا تھا۔ اِس محبت کی کوئی منزل نہیں ہے۔ خدا نے تمھیں بلونت کا ہمسفر بنادیا ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

وہ خاموش آنکھوں سے مجھے تاکتا رہا۔ ”اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تم بلونت کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات کرو۔ مجھے بھول جاؤ۔ میں کسی اور کی امانت ہوں۔ امّی نے فیضی سے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔ عنقریب ہی ہم شادی کے بندھن میں بندھنے والے ہیں۔ میں نے تو تمھاری زندگی برباد کر ہی دی۔ لیکن اب تمھاری اِن باتوں سے میری زندگی بھی تباہ ہو جائے گی۔ جو تم ہرگز نہیں چاہو گے۔“ حالانکہ یہ الفاظ کہتے ہوئے مجھے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

”میں دور جانے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں میرے سامنے ہی تم بلونت کی زندگی میں شامل ہو جاؤ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“

”تم جیسا چاہتی ہو ویسا ہی ہو گا۔“ وہ فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گیا تھا۔ گرجیت کے بیان، میڈیکل رپورٹ اور دیگر قانونی کارروائیوں میں کچھ عرصہ بیت گیا۔ دوسرے دِن اُن دونوں کو چندی گڑھ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ہم تینوں ساتھ ہی اسٹیشن پر ٹہل رہے تھے۔ تینوں کے خیالات الگ الگ سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔ بلونت خوش تھی، گرجیت خاموش اور میں تمام جذبوں سے عاری، دل کہیں تھی تو دماغ کہیں اور۔ مجھے واقعی لگ رہا تھا کہ گرجیت میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے۔ میں بے چین تھی۔ کسی کو یہ سوچ کر رخصت کیا جائے کہ وہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہے، تو دُکھ تو ہوتا ہی ہے۔ میرے دل کے ایک کونے میں وہ اتنے برسوں سے رہ رہا تھا، دوست بن کر ہی سہی، میں نے اسے چاہا تو تھا۔ ٹرین آگئی تھی۔ آج اس کی سیٹی مجھے سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ سب سے پہلے بلونت نے لپک کر پائے دان پر پیر رکھا۔ نئی زندگی کی جانب پہلا قدم۔ مختصر سا سامان لیے گرجیت بھی اس کے پیچھے پیچھے ٹرین پر چڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ جو اس نے بغل میں دبا رکھا تھا۔ ٹرین نے پھر دلخراش سیٹی ماری۔ گرجیت نے بیگ کھولا۔ اور لال کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک چیز میری جانب بڑھا

دی۔ میں سمجھ گئی اس میں یقیناً وہ قرآن شریف ہو گا جو میں نے اسے بطور تحفہ دیا تھا۔ ٹھیک ہی ہے، آدمی جب جاتا ہے تو سارے پرانے رِشتے توڑ کر ہی جاتا ہے۔ میں تو کسی بھی سفر میں اس کی ہمسفر نہ بن سکی۔ خدا کرے یہ دونوں عمر بھر ایک دوسرے کے شریکِ سفر رہیں۔ میں نے دھڑکتے دِل اور لرزتے ہاتھوں سے اس کا تحفہ قبول کیا۔ "خوش رہو" میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹرین رفتار پکڑ رہی تھی۔ "کبھی کبھی خط لکھتے رہنا۔ میں اسٹیشن پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ ٹرین سے سرخ چوڑیوں بھرا ہاتھ برابر دُور تک ہوا میں میری جانب ہلتا رہا۔

گھر لوٹ کر میں نے اس لال کپڑے میں لپٹی ہوئی مقدس آسمانی کتاب کو دیکھا۔ انسان جب پریشان اور ہراساں ہوتا ہے تو مذہب کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ ایک اَن دیکھا سا ہمدرد اسے دُور آسمان پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ بسم اللہ کہہ کر میں نے کپڑا اُٹھایا۔ "گرو مکھی ہے" بے اختیار میرے ہونٹ ہلے۔ اس کا مطلب ہے گرجیت سارے رشتے توڑ کر نہیں گیا ہے۔ جلد سے نظریں اُٹھا کر میں نے ورق اُلٹا۔ بڑے بڑے الفاظ میں لکھا تھا منیرہ...... میں نے ایک اور ورق اُلٹا۔ موتی جیسے الفاظ ہر ورق پر بکھرے ہوئے تھے۔ من پریت...... من پریت۔ من پریت......

یا خدا میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ گرو مکھی کو میں نے دونوں ہاتھوں میں اُٹھایا اور سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ شاید مجھے بھی اس سے محبت تھی۔ آپ دیکھیے گا ایک دِن پھر وہ اپنی اُجڑی ہوئی محبت کے ساتھ مجھ سے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ٹکرائے گا۔ وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔ ایک بار پھر......!

▭▭

اپنے حصّے کے خواب

میں معمولی باتوں پر خوش اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو دینے والی لڑکی ہوں۔ میرا دل کانچ کا بنا ہے، جس پر تم دراریں ڈالتے رہتے ہو۔ یاد کرو گزشتہ دس سالوں میں ہماری اس ناخوشگوار شادی شدہ زندگی میں کتنی دراریں آئی ہیں۔ میں تنگ آچکی ہوں ان دراروں کو پاٹتے پاٹتے۔ مجھے لگتا ہے کسی دن میرا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

"کیا۔ کیا ہے آخر تم نے ایسا؟" ساغر نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "جب دیکھو اپنے وجود کا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہو۔ روپے تو میں کما کر لاتا ہوں نا۔ دن بھر آفس میں مغزماری کرتا ہوں تب کہیں جاکر روپے ہاتھ آتے ہیں۔"

"جب گھر کے اخراجات کا تم نے ذمہ لیا ہے تو اس ذمہ داری کو نبھانے میں یہ غصہ کیسا۔" رخصی نے بھی برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہمیشہ اپنے روپوں کی دھونس جما کر میرے دل کو ٹھیس پہنچاتے رہتے ہو۔ تم ایسا کرو کہ ایک بار ہی پتھر اٹھا کر دے مارو تاکہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔ تمھارے دل میں اگر معمولی سی خراش یا ناراضگی پیدا ہو جائے تو اسے بھلانے کے لیے تمھیں کئی دن چاہیے ہوتے ہیں۔ خود اپنے آپ کو شیشہ اور مجھے پتھر سمجھ لیا ہے۔ جب دیکھو نوکروں کی طرح مجھ پر حکم چلاتے رہتے ہو۔ میں بھی پڑھی لکھی ہوں، اگر نوکری کروں گی تو تم سے زیادہ نہیں تو برابر کما کر تو ضرور بتادوں گی۔"

"ہاں بس یہی غرور تو ہے جس کی وجہ سے تم اپنے آپ کو مجھ سے افضل سمجھتی ہو۔ جب دیکھو اپنے ادبی ہونے کا رعب جماتی رہتی ہو۔ مجھے دیکھ کر ہی میرؔ، غالبؔ اور مومنؔ کی غزلیں گنگناتی ہو۔ جب میں نے ایک مرتبہ کہہ دیا ہے کہ یہ شاعری فضول

کی چیز ہے تو تم اپنا شوق بدل کیوں نہیں لیتیں۔

"یہ...... یہ دیوانِ غالب پھر خرید لائیں۔ کتنی، آخر کتنی مرتبہ میں نے کہا ہے کہ کوئی ڈھنگ کی کتاب لاؤ کو کنگ کی۔ ماں باپ نے کھانا دانا بنانا تو سکھایا نہیں کم از کم اب تو سیکھ لو۔ اور وہ تمھارے گھر والے جب دیکھو مشاعروں کے ذکر ہو رہے ہیں۔ فیض کی غزلیں گا رہے ہیں، پریم چند کو یاد کر رہے ہیں، اور وہ تمھارے منچورے ماموں کیا لہک لہک کر گاتے ہیں۔ قسمت کی اندھیری راتوں میں، جب ان کی نظر ہو جاتی ہے، گھبرا کے اندھیرا چھٹتا ہے، شرما کے سحر ہو جاتی ہے۔ سارا خاندان بگڑا ہوا ہے۔"

"خبر دار ساغر جو تم نے میرے گھر والوں کو ایک لفظ بھی کہا تو۔ تم اور تمھارے کوڑھ مغز گھر والے کیا جانیں کہ ادب سے زندگی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ تم اور تمھارا خاندان ہمیشہ کھانے، پینے، پہننے کی فکر میں دُبلا ہوتا رہتا ہے۔ مرغا بنالو، انڈے کا حلوہ کھالو، بریانیاں بن رہی ہیں، اپنے جسم اور دماغ پر تم لوگوں نے چربی کی پرتیں جمالی ہیں۔ کبھی سماج اور ادب کے متعلق بھی سوچا ہے۔ دراصل لوہے کی فیکٹری میں کام کرتے کرتے تمھارا دل بھی لوہے کا ہو گیا ہے۔ کبھی اپنے اس دل سے لوہے کی پرت ہٹا کر میرے متعلق بھی سوچو۔ میرے آنے سے تمھارے حصّے کے خواب تو پورے ہو گئے لیکن میرے خوابوں کا کیا بنا۔ تمھیں ایک خوبصورت بیوی چاہیے تھی جو ہر روز لق دق زیوروں میں سجی دروازے پر کھڑی ہو کر تمھارا انتظار کرے۔ جب تم آؤ تو مسکرا کر تمھارے جوتے اُتارے، سر پر پلو ڈال کر تمھیں چائے پیش کرے اور رات کو بستر پر لیٹ کر تمھیں رِجھائے۔ تمھارے بدبودار جسم سے لپٹ کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے......"

"...... بے شمار برسوں تک ساغر میں نے یہی سب کیا جو تم چاہتے تھے۔ تم چاہتے تھے کہ میں مشاعروں میں نہ جاؤں، میں نہیں گئی۔ تم چاہتے تھے کہ میں کہانیاں لکھنا چھوڑ دوں، ناول، افسانے اور غزلوں کی کتابیں نہیں پڑھوں۔ میرے چہرے سے میرے درد کا اندازہ تم نے کبھی نہیں لگایا۔ تم نے کبھی میری بنجر اور اُجاڑ رُوح کے دالانوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ تم نے کبھی میری خواہشوں کے متعلق نہیں سوچا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میرے قلم پر پابندی لگا کر تم نے میرے جذبوں، میرے

خیالات کو کال کوٹھری میں بند کر دیا۔ میں مسلسل عذاب جھیل رہی ہوں۔ مجھے میری آزادی لوٹا دو۔ مجھے آزاد کر دو پلیز ساغر۔"

"آخر تم کیا چاہتی ہو رخصی۔ میں نے تمھیں دنیا کی ہر خوشی دی ہے۔ یہ عالیشان کوٹھی، یہ چمچماتی گاڑیاں، سونے چاندی کے زیورات، بیش قیمتی کپڑے، ڈھیروں نوکر چاکر، آخر اور تمھیں مجھ سے کیا چاہیے۔"

"ساغر تم کیوں نہیں سمجھتے، زندگی کی یہ آرائشیں تم نے مجھے دیں، لیکن ان سب سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ میرے جسم کو زیوروں سے لاد کر تم نے میرے دماغ پر تالے جڑ دیے۔ اپنا شوہر، گھر، قیمتی لباس اور دو وقت کی روٹی۔ اس کے علاوہ میری زندگی میں کیا رہا۔ میں آگے بڑھنا چاہتی تھی، تم نے میری کتابوں کو الماری میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ آخر میں اپنی خواہشوں کو اب کہاں تلاش کروں۔ تم مجھے اخبار نہیں پڑھنے دیتے، ٹی وی نہیں دیکھنے دیتے، کہانیاں نہیں لکھنے دیتے۔ کسی کے گھر نہیں جاتے۔ آخر ان چاندی کی دیواروں کا میں کیا کروں۔ چاٹوں انھیں، دَم گھٹتا ہے میرا۔ مار دیا ہے تم نے مجھے۔ تم قاتل ہو میرے جذبوں کے ......"

"......اس کے برعکس تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ ایک ایک ہفتے کام کا بہانہ بنا کر گھر سے غائب رہتے ہو۔ تم کیا کیا کام کرتے ہو اپنی سیکریٹری کے ساتھ مجھے اچھی طرح پتہ ہے۔ تمھارے پاس بہت پیسہ ہے نا، تمھیں گھر میں الگ قسم کا پیار چاہیے اور باہر الگ قسم کا۔ شاید اسی لیے تم نے اپنی سیکریٹری روبی کو فیکٹری کے پاس والا گھر دے دیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تم اس گھر میں نہیں رہتے تو اس مکان میں ہوتے ہو، بیوی کے طور پر تمھیں سیدھی سادی، سجی دھجی موم کی بے زبان گڑیا چاہیے۔ اور محبوبہ کے طور پر موڈرن اسکرٹ پہننے والی روبی۔ تم مردوں کی دنیا بھی کتنی عجیب ہے۔ جھوٹ، فریب اور ظلم کی دنیا۔ آخر تم کس طرح یہ دوہری زندگی جی لیتے ہو......"

"......ایک مرتبہ تم اس گھر کی دہلیز پار کر چکے ہو۔ اس لیے اب تمھیں مجھے روکنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ تم دن بھر یہ سوچ کر خوش ہوتے ہو گے کہ میں تمھارے فون کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ تمھارے فراق میں بیٹھی دُبلی ہو رہی ہوں گی۔ تم آؤ گے اس انتظار میں دستر خوان بچھائے بیٹھی ہوں گی۔ مگر تمھیں یہ جان کر افسوس ہو گا کہ میں

بدل گئی ہوں۔ میں تمھارا انتظار نہیں کرتی ہوں۔ جب مجھے بھوک لگتی ہے کھانا کھا لیتی ہوں......"

"...... تم نے میرے ذہن پر جو تالے جڑے تھے وہ میں نے توڑ ڈالے ہیں۔ تم اب اس گھر میں نہیں رہتے۔ میری کتابوں میں نہیں رہتے۔ اس لیے اب تمھیں میری زندگی میں رہنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ یا تو تم یہاں سے چلے جاؤ یا پھر مجھے یہاں سے جانے دو۔ تمھارے حصّے کے خواب پورے ہو چکے ہیں۔ اب مجھے اپنے حصّے کے خواب پورے کرنے ہیں......"

"...... گھبراؤ نہیں ساغر۔" رخصی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ گھومنے پھرنے کا مجھے شوق نہیں ہے۔ سفر سے مجھے حد درجہ نفرت ہے۔ اس شہر کی سڑکوں اور عمارتوں سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ تم نے مجھے اس گھر سے کبھی نکلنے ہی نہیں دیا......"

"...... اپنے شہر میں بھی مجھے ایک کمی شدّت سے کھٹکتی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ کاش یہاں سمندر کا کوئی حسین سا کنارہ ہوتا، جہاں بیٹھ کر میں لہروں کو گاتے ہوئے سنتی، کناروں سے موجوں کو ہم آغوش ہوتا دیکھتی اور سورج کے بڑے سے سنہری گولے کو جب تک وہ غروب نہیں ہو جاتا ٹکٹکی باندھے مسلسل تکتی رہتی، تکتی رہتی، جب تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو جاتا۔ لیکن زندگی میں بہت سی کمیاں ہوتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہمیں گزارا کرنا پڑتا ہے۔ میں تمھارے بغیر جی لوں گی۔ تم نے اس کوٹھی میں لگے گھنے درختوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے۔ جب تم نہیں ہوتے تھے تو میں راہ میں لگے ہر اس درخت کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر ایک قدم چل کر دیکھتی تھی کہ اس کا سایا جدا ہو گیا ہے اور میں چلچلاتی دھوپ میں پھر تنہا کھڑی ہوں۔ اپنے اجڑنے کا درد آج میں شدّت سے محسوس کر رہی ہوں۔ تمھاری کوٹھی کی یہ پھول پتّوں سے لدی پھندی ہری بھری زمین نے مجھے بنجر بنا دیا ہے۔ مجھے زندگی کی یہ آرائش نہیں چاہیے۔ شوہر کا گھر میری آخری پناہ گاہ نہیں ہے......"

"...... ساغر تم یہ بات کبھی سمجھتے ہی نہیں کہ زیور، گاڑیاں، کوٹھی، بیش قیمتی لباس عورت کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ سب آرائش، زیبائش

بہت بعد کی باتیں ہیں۔ایک عورت سب سے پہلے اپنے شوہر کا سچّا پیار چاہتی ہے۔ تم نے مجھے پیسا دیا اور بہت دیا لیکن کیا میں اس پیسے سے تمھارا پیار خرید پائی، کیا تمھاری ہمدردی خرید پائی۔یاد کرو ساغر گزشتہ دس سالوں میں تم نے کتنی مرتبہ مجھ سے میرے متعلق پوچھا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ محسوس کیا ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میرے بھی اپنے شوق تھے،اپنی آرزوئیں تھیں۔اپنی خواہشیں تھیں۔تم نے کبھی میرے شوق اور مرضی کی پروا نہیں کی۔ سفید رنگ میری جان ہے۔نہ تم اس رنگ کے کپڑے پہنتے تھے، نہ مجھے پہننے دیتے تھے۔ میری خواہش، میرے شوق، میرے جذبات، میری آرزوئیں بے موت مرتی رہیں اور تم نے کبھی پروا نہیں کی۔تمھیں یہ جان کر پتہ نہیں خوشی ہوگی یا افسوس کہ ڈاکٹر نے مجھے ٹی بی بتائی ہے۔اس سے پہلے کہ یہ ٹی بی کینسر بن جائے میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ تمھاری اس لمبی چوڑی کوٹھی میں میرا دم گھٹتا ہے......"

"......ساغر تم، تم ایک جادوگر ہو جس نے اچھے کھانے کا لالچ دے کر مجھے یہاں قید کر دیا۔ تم نے سونے کا نوالہ کھلا کر میری روح کو چاندی کے پنجرے میں قید کر دیا۔ میں نے اپنی روح کو آزاد کرالیا ہے۔دس سال تمھارے ساتھ گزار چکی ہوں، باقی بچی زندگی مجھے اپنے طریقے سے جی لینے دو۔" رخصی نے اپنا زنگ لگا لوہے کا پرانا ٹرنک اٹھایا، جس میں اس کی کتابیں اور بیش قیمتی ڈگریاں تھیں۔

ساغر اتنی دیر سے خاموشی سے تمام باتیں سن رہا تھا۔"آخر کہاں جاؤ گی؟ تمھیں یہاں کیا کمی ہے؟ مت جاؤ رخصی۔"

"مجھے جانے دو ساغر۔ میں تم سے طلاق نہیں لے رہی ہوں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی، لیکن ایک سچّا پیار کرنے والا دوست ضرور چاہتی ہوں۔ ہم نے پہلے محبت کی پھر شادی کی۔ شادی سے پہلے تم میرے دوست تھے، شادی کے بعد تم شوہر بنے اور پھر حاکم بن بیٹھے۔ شاید میرے دور رہنے سے تم پھر دوست بن جاؤ۔ خدا حافظ۔ میں جا رہی ہوں اپنی قلم کی دنیا میں جہاں میرے حصّے کے خواب پورا ہونے کے لیے میرا انتظار کر رہے ہیں۔

□□